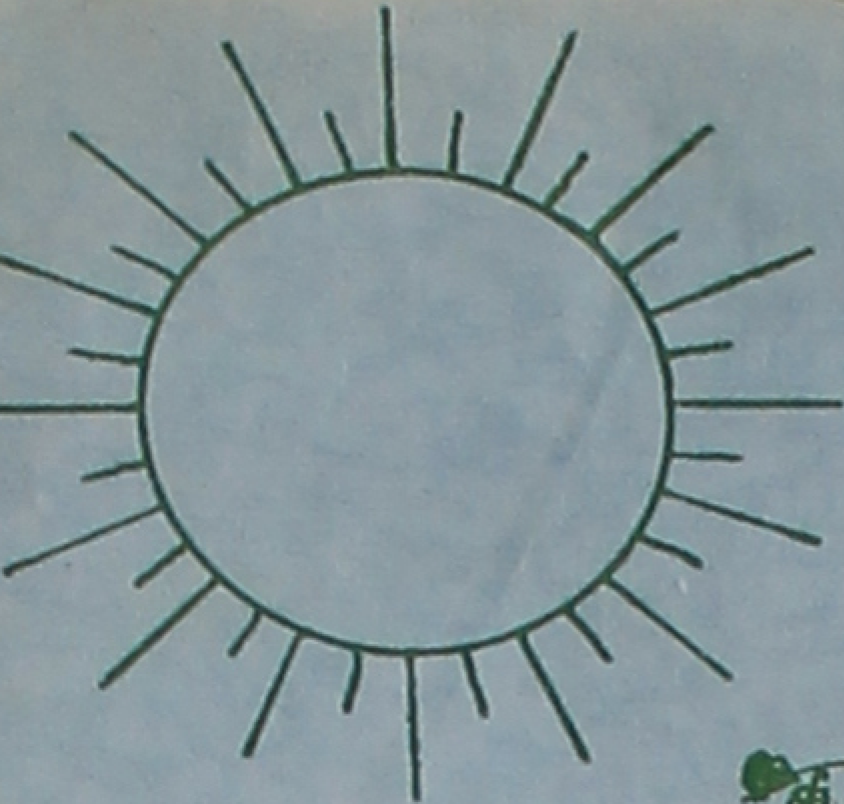




میرے
والدین کی کہانی
میری زبانی

کیلاس ناتھ کاٹجو





فہرست عنوان

پیش لفظ

از

ہز ہائینس سکندر صولت افتخار الملک الحاج نواب محمد حمید اللہ خاں بہادر

جی سی ایس آئی و جی سی آئی ای فرمانروائے بھوپال

میرے محترم دوست کیلاش ناتھ کاٹجو نے اپنے والد پنڈت تربھون ناتھ کاٹجو کی زندگی کے حالات کو انگریزی میں تحریر کیا تھا۔ یہ اُس کا اُردو ترجمہ ہے۔ عرصہ ہوا مجھے جاورہ میں پنڈت جی سے ملنے کا اتّفاق ہوا تھا۔ مرحوم اُن اخلاقی خوبیوں کا نمونہ تھے جن کو ہماری مشترکہ ہندو مسلم تہذیب میں نہایت اعلیٰ درجہ دیا جاتا ہے۔ اس تہذیب نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسا خلوص اور اتّحاد پیدا کر دیا تھا کہ دونوں اپنی مذہبی روایات پر قائم رہ کر ایک دوسرے کے ساتھ دلی ہمدردی، محبت اور ایثار کا برتاؤ کرتے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی رواداری کے لئے شہنشاہ اکبر کے عہد کا خاص طور سے حوالہ دیا جاتا ہے۔ مگر یہ روابط اس عہد سے پہلے ہی قائم ہو چکے تھے۔ سلطان زین العابدین، فرمانروائے کشمیر اپنی قلمرو میں ہندوؤں کے ساتھ نہایت لطف و کرم سے پیش آتے تھے۔ دکن میں ابراہیم عادل شاہ نے سلطنت کا تمام کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔ چتوڑ کے رانا سانگا کی بیوہ رانی کا ہمایوں کو بھائی بنانا اور ہمایوں کا تمام عمر اس رشتہ کو نبھانا ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ مغل بادشاہوں میں مُرید کرنے کا بھی رواج تھا۔ چنانچہ شہنشاہ جہانگیر جب کسی کو مُرید فرماتے تو اُس سے یہ عہد بھی لیتے تھے کہ وہ شخص کسی مذہب و ملت کیساتھ عداوت نہ رکھیگا۔ شہنشاہ خود ہندو بزرگوں کی زیارت کے لئے پیدل چل کر اُن کی جائے قیام پر جاتے اور گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔

آخری دور میں ٹیپو سلطان نے سری شنکرہ چارج جی کے مٹھ کو سب سے بڑی جاگیر دی تھی۔ ایسے ہی خلوص و احترام کا برتاؤ ہندوؤں کا مسلمانوں کیساتھ تھا۔ شیواجی کے باپ کا نام شاہ جی اور چچا کا شرف جی تھا۔ ان کی وجہ تسمیہ اُن کے والد کے دل میں ایک مسلمان بزرگ شاہ شریف کے احترام کا جذبہ تھا۔ شیواجی کے سامنے مال غنیمت میں جب کبھی کلام مجید آتا تھا تو وہ اُس کو نہایت تعظیم کے ساتھ مسجد میں رکھوا دیا کرتے تھے۔ ہندو رئیس مسلمان بزرگوں کی درگاہ

کے لئے علاقے نذر کرتے تھے۔ ریاست گوالیار میں سب سے بڑی جاگیر شاہ منصور
کی اولاد کی تھی۔ یہاں جب نیا راجہ ہوتا تھا تو تخت نشینی کے موقع پر راجہ کی پیشانی پر
شاہ منصور کا سجادہ نشین ہی ٹیکہ لگاتا تھا۔ مرحوم مہاراجہ مادھوراؤ سندھیا
گیارہویں شریف اور محرّم جس عقیدت اور اولوالعزمی سے مناتے تھے اس کی
نظیر ملنا مشکل تھی۔ قریب ماضی میں مہاراجہ صاحب پٹیالہ نے سرہند میں
ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی تھی۔ جس کے افتتاح کی تقریب میں اکابر علماء اسلام کو
مدعو کیا گیا تھا۔ اسی طرح مہاراجہ صاحب کپورتھلہ نے اپنے محل کے اندر جب
مندر بنوایا تو اُس کے قریب ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ ریاست بھوپال
کی تاریخ میں بھی اس قسم کے اتّحاد اور رواداری کی مثالیں موجود ہیں۔
اس کی بیّن مثال یہ ہے کہ اس ریاست میں اکثر و بیشتر ہندو اصحاب
فرمارو ایانِ دولت بھوپال کے قریب ترین معتمد اور وزراء رہے۔ اور دَورِ رواں
میں بھی یہاں کے وزیرِ اعظم ہندو تھے۔ یہاں ہندو مسلم اتحاد اس قدر
اُستوار ہو گیا تھا کہ ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء کے طوفانی فرقہ وارانہ فسادات میں بھی
کسی قسم کا کوئی ناگوار واقعہ ریاست بھوپال میں پیش نہیں آیا۔ شرافت اور
باہمی رواداری کے یہ برتاؤ تھے جن کی برکت سے ہندو اور مسلمان کامل سکون
واطمینان کے ساتھ مِل جُل کر رہتے تھے۔ ضرورت ہے کہ ان بنیادوں کو مزید
پائدار بنایا جائے۔ مگر بدقسمتی سے واقعات اس کے خلاف نظر آتے ہیں۔

ایسے ماحول میں پنڈت صاحب مرحوم کے حالات زندگی کھوئی ہوئی یکجہتی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اگر ان کی پیروی کی جائے تو ممکن ہے کہ عہد حاضرہ کے نوجوان خیالات کے اس سیلاب میں بہنے سے محفوظ رہ جائیں جس سے ہمارے ملک کی روایات اور فلسفہ کو زیادہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

خادم ملت

حمید اللہ

مقدمہ

ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار سال تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رہنے سہنے سے جو مشترکہ تہذیب وجود میں آئی وہ نہ تو ہندو تہذیب ہی کہی جاسکتی ہے اور نہ مسلم، بلکہ اُس کو "ہندوستانی تہذیب" کہا جاسکتا ہے جو بطور میراث ہمیں اپنے بزرگوں سے ملی ہے۔ ابتدا ہی سے یہ دونوں مہذب قومیں اوضاع و اطوار میں ایسی متحد اور زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی ہم رنگ ہوگئی تھیں کہ مذہبی عبادت گاہوں سے باہر یہ تمیز کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون؟ گھریلو رسومات مثلاً شادی بیاہ نیز مذہبی تہوار اس طرح مل جُل کر منائے جاتے تھے کہ گویا دونوں فرقے ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اکثر مسلم گھرانوں میں لڑکے کی پیدائش کے وقت جو گیت گایا جاتا تھا وہ یہ ہوتا تھا "گوکل نگری کنہیا بھئے آج"۔ ہندوؤں کے تہوار اور تقریبات میں مسلمان اور مسلمانوں کے تہوار اور تقریبات میں ہندو بلاتفریق مذہب و ملت برابر کا حصہ لیتے رہے ہیں۔ دہلی میں "پھول والوں کا میلہ" اسی سلسلہ کی ایک یادگار ہے، جو اب تک قائم ہے۔

رکشا بندھن جو ہندوؤں کا ایک قدیم اور دلکش تہوار ہے ہندو مسلم

اتحاد کے رشتہ کو مضبوط کرنے کا خاص ذریعہ بن گیا تھا۔ جب کوئی ہندو خاتون کسی مسلمان مرد کے راکھی باندھ دیتی تھی تو اس کے تمام حقوق مثل حقیقی بہن کے ادا کئے جاتے تھے۔ ہمایوں سے لیکر بہادر شاہ ظفر کے عہد تک اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بادشاہوں نے اس رشتہ کو جو راکھی باندھنے کی رسم سے قائم ہوا تھا ان بہنوں کے ساتھ حقیقی بھائی کی طرح نبھایا۔

اسی طرح اگر آخری عہد کی ہندی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ہندوؤں سے کہیں زیادہ تعداد مسلمان شعراء کی نکلے گی جنھوں نے ہولی۔ بسنت۔ دادرے ٹھمریاں اور بارہ ماسے کثیر تعداد میں نہایت ذوق اور شوق سے لکھے۔

چودھری دلّو رام کوثری جو مسلمانوں کے عہد حکومت کے بعد پیدا ہوئے اور جن کی ساری عمر انگریزی دور میں گذری، لیکن انھوں نے نعت گوئی پیغمبر اسلام کو اپنا شعار بنالیا تھا اور ساری عمر اسی میں صرف کردی۔ ان کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

مجھے نعت نے شادمانی میں رکھا ۔۔۔ کہ مصروف شیریں زبانی میں رکھا
میں لکھتا رہا نعت اور حق نے شب بھر ۔۔۔ قمر کو مری پاسبانی میں رکھا
نہیں اختیار اب سے کی نعت گوئی ۔۔۔ یہی شغل ہم نے جوانی میں رکھا

مسلمانوں کے تہواروں پر ہندوؤں کا خلوص و محبت کے ساتھ شریک ہونا عید پر مسلم احباب کے گھر جانا اور بچوں کو عیدیاں دینا، تعزیہ داری اور

عشرۂ محرم کی رسومات کو مسلمانوں سے بھی بڑھ چڑھ کر ادا کرنا، بعض ہندو رئیسوں کا مجالس عزا میں لاکھوں روپیہ صرف کرنا۔ اپنی اولاد کو حضرت امام حسینؑ کی نام کے ساتھ منسوب کرنا وغیرہ ایسی روشن حقیقتیں ہیں جن سے تاریخ کے صفحات پُر ہیں۔ لکھنؤ کے نامی گرامی رئیس لالہ حسین بخش کے نام سے کون واقف نہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر بھی مسلمانوں ہی کے حسن عقیدت کی طرح ہندو نذر و نیاز چڑھاتے تھے۔ خواجہ اجمیری کے مزار کے طلائی اور نقرئی کٹہروں اور اوقافِ درگاہ کی فہرست میں مسلمانوں کے نام کے ساتھ ساتھ راجپوتوں اور مرہٹوں کے نام بھی موجود ہیں۔ ہندوؤں کے بنائے ہوئے امام باڑے اور مسجدیں آج بھی زبان حال سے اس سماجی اتحاد و یگانگت کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کر رہی ہیں کہ "اب جس جگہ ہے داغ وہاں پہلے درد تھا" اسلام کی دینی کتابوں اور عربی فارسی کی اشاعت میں بھی ہندو مسلمانوں کے دوش بدوش رہے ہیں۔

ہندو مطابع میں قرآن شریف کی چھپائی کا مسلم عقائد کے مطابق خاص اہتمام رکھا جاتا تھا۔ دونوں فرقوں میں باہمی ادب و احترام کا بھی یہ عالم تھا کہ ایک خاندان کے خرد دوسرے خاندان کے بزرگوں کا نام لینا خلاف ادب سمجھتے تھے۔ دہلی کی حکومت کمزور ہو جانے پر ملک میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں جن کی ہندو مسلم رعایا باوجود اختلاف مذہب کے

باہم ایسے متحد تھی کہ جب کبھی کسی ریاست پر کوئی غنیم حملہ کرتا تو بلا لحاظ مذہب وملت دونوں فرقے ہندو مسلم باہم ملکر دشمن کا مقابلہ کرتے اور اپنے وطن مالوف کی خاطر جان و مال کی بازی لگا دیتے تھے۔ ہندوؤں کو مسلمانوں پر اور مسلمانوں کو ہندوؤں پر پورا بھروسہ تھا۔ تاریخ میں اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

راجہ بھگوان داس، راجہ مان سنگھ، راجہ بیربل اور ٹوڈر مل شہنشاہ اکبر کے مخصوص معتمدین میں سے تھے۔ راجہ مان سنگھ اکبر کے نامی سپہ سالار اور مشیر کار رہے۔ اُودے پور کی مہم انہی کے سپرد کی گئی تھی۔ ٹوڈر مل اکبر کے مشہور و معروف وزیر رہے اور بنگال کی مہم ان کے سپرد تھی۔ سندھ پار کے افغانوں کی سرکوبی کے لئے راجہ بیربل کو بھیجا گیا تھا۔ دارا نے جو لشکر جرّار مراد اور اورنگ زیب کے مقابلہ کے لئے بھیجا تھا اُسکی سپہ سالاری راجہ جسونت سنگھ کے سپرد کی تھی۔ عالمگیر نے راجہ جے سنگھ کی سرداری میں دکن پر مہم روانہ کی تھی۔ پانی پت کی تیسری لڑائی جو پیشوا بالاجی باجی راؤ اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان ہوئی اور جسے انگریزوں نے نہایت چالبازی سے "مرہٹہ و افغان جنگ" کا نام دیدیا ہے۔ اس جنگ میں پیشوا کی فوجی طاقت کا بہت بڑا انحصار اُس کے توپخانہ پر تھا اور یہ اہم محکمہ ایک مسلمان افسر ابراہیم خاں نامی کے سپرد تھا۔ پیشوا کی فوج کو شکست ہوئی۔ ابراہیم زخمی ہو کر جب احمد شاہ کے

سامنے پیش کیا گیا۔ اور درباریوں نے اسے لعنت ملامت کی تو اس وقت ابراہیم نے جو جواب دیا ہے وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور وفاداری وجاں نثاری کی نہایت روشن مثال ہے۔ یعنی "بحمد اللہ خلاف آئینِ سپہگری نکردم"۔ ناگپور کے راجہ نے بھوپال سر کرنے کے لئے صدیق علی خاں کو ۳۰ ہزار فوج کا سردار مقرر کر کے بھیجا تھا۔ اور یہی صدیق علی خاں راجہ مذکور کی مدار المہام بھی تھے۔ جھانسی کی رانی نے جب انگریزوں سے جنگ کی ہے تو نواب صاحب باندہ نے رانی کا ساتھ دیا اور انگریزوں کے خلاف لڑے۔

ریاست بھوپال میں نواب فیض بہادر کے دورِ حکومت میں دیوان بجے رام تمام سیاسی و انتظامی امور کے واحد مختار رہے۔ اور ان کی وفات پر انکے بیٹے گھانسی رام کو دیوان ریاست مقرر کیا گیا۔ نواب قدسیہ بیگم کے وزیر با اختیار اور فوجی سپہ سالار خوشوقت رائے تھے۔ نواب حمید اللہ خاں صاحب کے وزیر اعظم راجہ اودھ نرائن تھے اور ان کے آخری عہد حکومت میں پنڈت چتر نرائن مالوی اس عہدۂ جلیلہ پر مامور رہے۔

یہ خیال کرنا کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں نے اُن سے دب کر وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا، بہت بڑی تاریخی غلطی ہوگی۔ کیونکہ یہ واقعات صرف اُس زمانہ کے ہی نہیں ہیں جب مسلمانوں کی حکومت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا بلکہ اُس وقت کے بھی ہیں جبکہ شاہان دہلی کی

حکومت بالکل محدود اور برائے نام رہ گئی تھی اور ان کی حیثیت ایک جاگیردار یا پنشن خوار سے زائد نہ رہی تھی۔ یہ تمام امور محض باہمی محبت و ہمدردی، خلوص و یکجہتی کا سبب تھے۔ اور یہ بھی جبر کا اثر نہیں بلکہ صدق دلی اور بے لوثی کا نتیجہ تھا کہ مثنوی گلزار نسیم اور دستور الصبیان جو عہد شاہی اور ہندوؤں کی تصانیف ہیں، ان میں حمد و نعت تو نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ لیکن بادشاہ کی مدح میں ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ جن مقدس اور پاکیزہ ہاتھوں نے اس ایوانِ تہذیب کی تعمیر اور آراستگی میں حصہ لیا ان میں کشمیری پنڈت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے خاندان موقع بموقع اپنے وطن مالوف سے نکل کر دہلی۔ لکھنو اور دیگر شہروں میں آباد ہوتے رہے اور ان بزرگوں نے باہمی اتحاد و اتفاق کے رشتوں کو مضبوط اور متحدہ تہذیب و معاشرت کو قائم کرنے کی جو بے بہا خدمات انجام دی ہیں اس کا بیّن ثبوت پنڈت دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار۔ برج نرائن چکبست اور سر تیج بہادر سپرو کے علمی و ادبی کارنامے ہیں۔

پنڈت کیلاش ناتھ کاٹجو کے بزرگ بھی اسی طرح ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ہوا جب کشمیر سے ریاست جاورہ میں آکر آباد ہوئے اور اُس وقت سے لے کر

آج کے دن تک جاورہ کے قدیمی مسلم خاندانوں سے ان کے خاندان کے تعلقات نہایت ہی عزیزانہ اور مخلصانہ چلے آرہے ہیں۔ آپ کے والد صاحب محترمی جناب پنڈت تربھون ناتھ جی صاحب سے نیازمندی حاصل کرنیکا مجھے بھی کافی شرف حاصل رہا ہے۔ کیونکہ علاوہ ہمارے خاندانی تعلقات کے میرا زیادہ تر وقت پنڈت کیلاش ناتھ جی صاحب کے بھائی پنڈت امرناتھ جی صاحب کاٹجو کے ساتھ صرف ہوتا تھا اور جب پنڈت جی صاحب محترمی مجھے دیکھتے تھے تو مثل اپنی اولاد کے نہایت شفقت اور پیار سے لکھنے پڑھنے کی طرف نہایت موثر پیرایہ میں توجہ دلاتے تھے۔ اس زمانہ میں جاورہ میں بالعموم اور میرے خاندان میں بالخصوص تعلیم کا کوئی چرچا نہ تھا۔ اگر مجھے پنڈت امرناتھ جی صاحب کی مشفقانہ ہمدردی اور امداد اور محترمی پنڈت تربھون ناتھ جی صاحب کی بزرگانہ تعلیم اور پندونصائح کا موقع نہ ملتا تو شاید میں بھی اپنے دوسرے عزیز اور رشتہ داروں کی طرح تعلیم سے بےبہرہ رہتا۔

پنڈت جی صاحب محترمی کے ایک شفقت نامہ کی نقل اس تذکرہ میں شامل کیجارہی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے سے صاحب موصوف کی اس رواداری کے جذبات اور ہندو مسلم یگانگت اور باہمی خلوص کے خیالات کا ثبوت مل رہا ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب ہمیں ورثہ میں دیتی چلی آئی ہے اور جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ

خلوص۔ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ فرقہ یا مذہب کی بناء پر نہیں بلکہ محض انسانیت کی بناء پر کیا جاتا رہا ہے۔ اور ہونا چاہیئے۔

مجھے یقین ہے کہ پنڈت جی بزرگوار کے حالاتِ زندگی سے جو پنڈت کیلاش ناتھ صاحب کاٹجو نے نہایت سچائی سے پیش کئے ہیں نہ صرف انکو خاندان کو باہمی انسانی ہمدردی، رواداری اور خلوص کا سبق ملیگا بلکہ انکی نیک و پاک اور کامیاب زندگی کی مثال ہم سب کے لئے شمع ہدایت کا کام دیگی اور امن و سلامتی و باہمی رواداری اور انسانیت کے ان اصولوں پر چلنے کا راستہ بتائیگی جن کو ہمارے رہبروں نے ہمارا نصب العین قرار دیکر ہمارے دستور اساسی کی بنیا رکھی ہے۔

آخر میں میری دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر پنڈت جی صاحب آنجہانی کی روح کو شانتی اور سکون بخشے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد عزیز الرحیم خاں

دیباچہ

میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ ہر شخص کو اپنے خاندانی، تمدّنی، معاشرتی اور اخلاقی نیک روایات کو قائم رکھنا چاہیئے، تاکہ اُس سے آنیوالی نسلیں بھی فائدہ اُٹھا سکیں۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مجھے اپنے والدین کی زندگی کے حالات لکھنا نہایت مناسب اور بہتر ذریعہ معلوم ہوا۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے اپنے والدین کے حالات زندگی لکھے۔

یوں تو ہر شخص کو فطرتاً اپنے ماتا پتا سے محبت ہوتی ہے اور وہ اُن کے نقش قدم پر چل کر خود اُن کے اعمال و اخلاق کا نمونہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن میں اپنے دل میں اپنے والدین کا غیر معمولی احترام محسوس کرتا ہوں اور اب بھی جب مجھے اپنی والدہ صاحبہ کے اخلاق و عادات، تہذیب و انتظام خانہ داری نیز اُس زمانہ کے لحاظ سے ان کی عام معلومات کا خیال آجاتا ہے تو مجھے وہ غیر معمولی ذہین، باسلیقہ اور دانشمند خاتون دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح میرے والد صاحب اپنے کردار کے اعتبار سے نہایت بلند، با اصول، مہذّب اور عالم باعمل انسان نظر آتے ہیں اور زندگی کے حالات و واقعات کے اعتبار سے وہ ہندو مسلم اتحاد کی قابل تقلید مثال معلوم ہوتی ہیں۔ ان ہی خیالات و جذبات کے زیر اثر میں نے سنہ ۱۹۴۴ء میں اپنی ماتا کے

حالاتِ زندگی پر ایک مضمون لکھا تھا، جس کو میری توقع کے خلاف اہل نظر نے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا اور پسندیدگی کا اظہار کیا اور اخبارات و رسائل میں اس کی کافی اشاعت ہوئی اور اُن لوگوں کو جو ہندوستانی عورتوں کے متعلق اچھے خیالات نہیں رکھتے تھے حالات مندرجہ مضمون کے دیکھنے سے حیرت سی ہوئی کہ ہندوستانی خواتین پردہ میں رہ کر بھی زیور علم سے آراستہ، ذی شعور اور سلیقہ مند ہو سکتی ہیں۔ یہ معلوم ہو کر کہ اپنی ماتاجی کے اُس مختصر تذکرہ سے لوگوں کو ہندوستانی تہذیب و اخلاق کا پتہ چلا اور ان کو اس کے مطالعہ سے فائدہ بھی پہنچا، میں نے اپنے پتاجی کے حالاتِ زندگی پر بھی سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک انگریزی مضمون لکھا اور اُس کو بھی عام مقبولیت حاصل ہوئی۔

جیساکہ تذکرہ کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا میرا آبائی وطن ریاست جاورہ ہے جو موجودہ صورت میں مدھیہ بھارت کا ایک جزو ہے۔ جب سے یہ ریاست قائم ہوئی اور اس میں مسلم فرمانروا اور اُن کے ساتھیوں کے خاندان آکر آباد ہوئے، اسی وقت سے میرا خاندان بھی یہاں آکر بسا، اور اُس وقت سے آج تک میرے اور ان خاندانوں میں محبت، خلوص، رواداری اور دوستی کا رشتہ قائم ہے۔ میرے مخلص اور عزیز دوست صاحبزادہ محمد عزیز الرحیم خاں صاحب بانئ ریاست کے خاندان سے متعلق ہیں اور ان کے اور میرے خاندان میں قدیمی عزیز دارانہ اور دوستانہ رشتہ برابر چلا آرہا ہے، اُنھیں جب اِس

مختصر کتابچہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اُنھوں نے نہایت مخلصانہ اور پُرزور مشورہ دیا کہ پتاجی اور ماتاجی کے حالاتِ زندگی کا اُردو زبان میں بھی ترجمہ کرا کے شائع کرا دیا جائے تاکہ ہندو مسلم تعلقات کی خوشگوار فضا میں غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی وجہ سے جو تکدّر پیدا ہو گیا ہے رفع ہو جائے اور یہ دونوں مہذّب فرقے ایک دوسرے سے قریب تر ہو کر مشترکہ کوشش سے اپنی ملک و تہذیب کو اونچا اوٹھائیں اور مثل سابق باہمی میل جول کے ساتھ اُسکی تعمیر و ترقی میں برابر کا حصّہ لیں۔

صاحبزادہ صاحب کا یہ خیال اور مشورہ مجھے بھی پسند آیا۔ چنانچہ میں نے انکی نگرانی میں، میرے دوست مسٹر واحد علی سے اس کا ترجمہ کرانے کا اتّفاق کیا۔ میں اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اُن دیرینہ تعلّقات کی بنا پر جو ریاست جاورہ سے رہے ہیں اور اس کرم کی وجہ سے جو بطور خاص میرے والد صاحب کی ذات سے مخصوص تھا نہ صرف اس ترجمہ پر نظرِ ثانی فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی بلکہ اُس کو اپنے "پیش لفظ" سے بھی زینت بخشی۔ آخر میں میں نہایت خلوص اور سچائی سے دعا کرتا ہوں کہ پرماتما ہم سب بھائیوں کو بھی وہی علم اور آگاہی بخشے جو اُس نے ہماری بزرگوں کو بخشی تھی، جس کی روشنی میں چلکر وہ امن و سلامتی اور انسانیت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

کیلاش ناتھ کاٹجو

والدمرحوم

تذکرہ

تعارف

یہ میرے والد مرحوم کے حالات زندگی کا ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ چند سال قبل میں نے اپنی والدہ مرحومہ کے حالات زندگی لکھے تھے جو بڑی قدر اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ جن اوصاف کی خاتون تھیں اُنھیں اخلاقی اور سماجی زندگی میں بہت بلند تصوّر کیا جاتا ہے۔ والد مرحوم کو بھی قدرت نے ایسے ہی اوصاف عطا فرمائے تھے، اس لئے امید ہے کہ ان کا تذکرہ بھی ناظرین کے لئے دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا۔

یہاں اس امر کا ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات نہ تو کسی ایسے شخص کے ہیں جس نے کالجوں میں تعلیم پا کر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہوں نہ کسی دولت مند کے ہیں جس نے اپنے مال و دولت کے ذریعہ نام پیدا کیا ہو بلکہ یہ ایک ایسے شخص کے سوانح حیات ہیں جسے ابتدائی زندگی ہی سے ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا اور جس نے غیر معمولی عزم و استقلال سے مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنے لئے کامیابی کی راہ نکالی۔

مرحوم میں خودداری کا احساس اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ کسی حالت میں

بھی اپنی کسی قسم کی توہین گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اپنی ان خداداد خوبیوں کی وجہ سے اُنھوں نے بڑی عزت اور نیکنامی کے ساتھ نہایت پاکیزہ اور طویل عمر بسر کی۔ وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے بڑے خلوص کے ساتھ پیش آتے تھے اور ضرورت پڑنے پر اُن کی ہر امکانی امداد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ چھوٹے بڑے خاص و عام سب اُن کا لحاظ کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے انتقال پر اتنا سوگ منایا گیا جس کی مثال علاقۂ جاورہ کی تاریخ میں ادھر کئی سو سال تک نہیں ملتی۔ میرے والد اپنے باپ کے متبنّٰی بیٹے تھے۔ اُن کے گود لئے جانیکا واقعہ بڑا دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اس واقعہ سے اخلاص و یگانگت کی اُس پختگی پر کافی روشنی پڑتی ہے جو کہ اکثر ہندو خاندانوں کو باہم وابستہ کئے ہوئے ہے۔

کاٹجو خاندان کی ہندوستان میں آمد

بھولا ناتھ جی ڈر اور منسا رام جی کاٹجو، دونوں کشمیری پنڈت تھے۔ یہ تو صحیح طور سے نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ خود کشمیر سے ہندوستان آئے تھے یا اُن کے بزرگوں نے ترک وطن کیا تھا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ۱۷۷۵ء کے قریب ان کی آمد ہندوستان میں ہوئی۔ اُس زمانہ میں کشمیری پنڈتوں کے جو خاندان کشمیر سے ہندوستان کا رُخ کرتے تھے وہ لاہور ہوتے ہوئے پہلے دہلی پہنچتے تھے۔ وہاں چند روز قیام کر کے جس حصّۂ ملک کے حالات کو اپنے لئے موافق

خیال کرتے تھے، وہاں منتقل ہو جاتے تھے۔ کچھ خاندان تو مشرقی سمت میں یوپی، بہار اور بنگال کی طرف چلے گئے۔ بعض نے مغرب یا جنوب و مغرب مثلاً راجستھان، وسط ہند (مدھ بھارت) کو اپنے لئے انتخاب کیا۔

ریاست جاورہ کا قیام

۱۸۱۸ء میں چوتھی مرہٹہ جنگ ہوئی جس کا نتیجہ مرہٹوں کی شکست کی صورت میں نکلا۔

کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں مہاراجہ ہلکر کی فوج کے ایک پٹھان سردار غفور خاں سے انگریزوں کو بڑی مدد ملی تھی۔ لہذا جب بمقام مہد پور ہلکر اور انگریزوں کے درمیان صلح نامہ مرتب ہوا تو جہاں ہلکر کو اپنے بڑے زرخیز علاقے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کو دینا پڑے وہاں وہ جاگیر جو کہ مہاراجہ نے غفور خاں کو دے رکھی تھی مستقل طور سے خانصاحب کی ذاتی ملکیت میں دلائی گئی۔ غفور خاں نے جاگیر کے ایک قصبہ جاورہ کو راجدھانی قرار دیکر اپنی حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا۔

کاٹجو خاندان کی جاورہ میں سکونت

اس واقعہ کے کچھ روز بعد منسارام کاٹجو نے غفور خاں کی ملازمت اختیار کی اور اسی زمانے سے جاورہ کاٹجو خاندان کا وطن بن گیا۔

ڈرا اور کاٹجو خاندان کے تعلقات

بھولاناتھ جی کی ایک بہن منسارام جی کاٹجو سے منسوب تھیں مگر انکے یہاں

کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بھولا ناتھ جی کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام بدری ناتھ اور دوسرے کا جوالا ناتھ تھا۔ یہ دیکھکر کہ بہن کا گھر اولاد کی مسرّت سے محروم ہے، بھولا ناتھ جی نے بدری ناتھ کو منسا رام جی کی فرزندی میں دیدیا۔ بدری ناتھ جی ۱۸۱۵ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے تھے۔ یہاں سے والدین کے ہمراہ جاورہ آئے اور اپنے گود کے رشتہ کے والد منسا رام جی کے انتقال پر ریاست کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ یہیں دوران ملازمت میں اُن کا انتقال ہوا۔ جوالا ناتھ جی نے بھی اپنی ساری عمر ریاست کی ملازمت میں گزاری اور اپنے بھائی بدری ناتھ جی کے انتقال کے چند سال بعد اُنھوں نے بھی آخرت کا سفر اختیار کیا۔

ان دونوں بھائیوں نے ۱۸۴۰ء و ۱۸۴۴ء کے درمیان جاورہ میں دو چھوٹے چھوٹے مکان قریب قریب خرید لئے تھے جہاں کہ یہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہنے لگے۔ بدری ناتھ جی کے گود لئے جانیکی وجہ سے اب اگرچہ اُن میں چچیرے بھائیوں کا رشتہ ہو گیا تھا، تاہم زندگی بھر دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح محبّت و اتفاق کے ساتھ رہتے رہے۔

بدری ناتھ جی کی صرف ایک صاحبزادی تھیں۔ لڑکا کوئی نہ تھا۔ اِن صاحبزادی کے دو لڑکے تھے لہذا بدری ناتھ جی نے ایک لڑکے کو گود لے لیا۔ لیکن یہ بچّہ زیادہ نہ جی سکا۔ چند روز کے بعد داغِ مفارقت دے گیا۔ بدری ناتھ جی

اور اُن کی بیوی پر اس حادثہ کا شدید اثر ہوا۔ بیوی کا دل تو اتنا ٹوٹ گیا کہ اُنھیں لڑکے کا اب کوئی ارمان ہی نہیں رہا۔ عزیز و رشتہ دار ہر چند کہتے تھے کہ میاں بیوی اپنا غم غلط کرنے اور خاندان کا نام قائم رکھنے کے لئے کوئی دوسرا لڑکا گود لے لیں مگر وہ یہ کہکر خاموش ہو جاتی تھیں کہ "پرمیشور نے میری قسمت میں لڑکا لکھا ہی نہیں"۔

یہاں بدری ناتھ جی کے حالات کو چھوڑ کر اُن کی بیوی کا ذکر میں نے صرف اس لئے کیا ہے کہ اس تذکرہ کے پڑھنے والے سمجھ سکیں کہ کشمیری پنڈتوں کے خاندانوں میں ہمیشہ عورت ہی کی بات کو بڑائی حاصل رہی ہے۔ خیر یہ تو ایک درمیانی جملہ تھا۔

میرے والد کی پیدائش

جوالا ناتھ جی کی بیوی کو بدری ناتھ جی کی اہلیہ کے رنج و غم کا دلی احساس تھا اور وہ چُپکے چُپکے کچھ سوچا کرتی تھیں۔ قدرت نے اُنھیں اولاد کی نعمت سے خوب نوازا تھا۔ ستمبر ۱۸۶۱ء میں ان کے یہاں تیسرے فرزند کی ولادت ہوئی۔ ابھی بچّہ گیارہ ہی دن کا تھا کہ وہ اُسے لئے ہوئے بدری ناتھ جی کے گھر گئیں اور یہ کہکر بچّہ ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا۔ "لیجئے صاحبزادہ مبارک ہو"۔

بدری ناتھ جی کی اہلیہ کی حیرت ابھی کم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ جوالا ناتھ جی کی بیوی بچّہ کو انکی گود میں چھوڑ کر اپنے گھر واپس آگئیں۔ بدری ناتھ جی کی بیوی

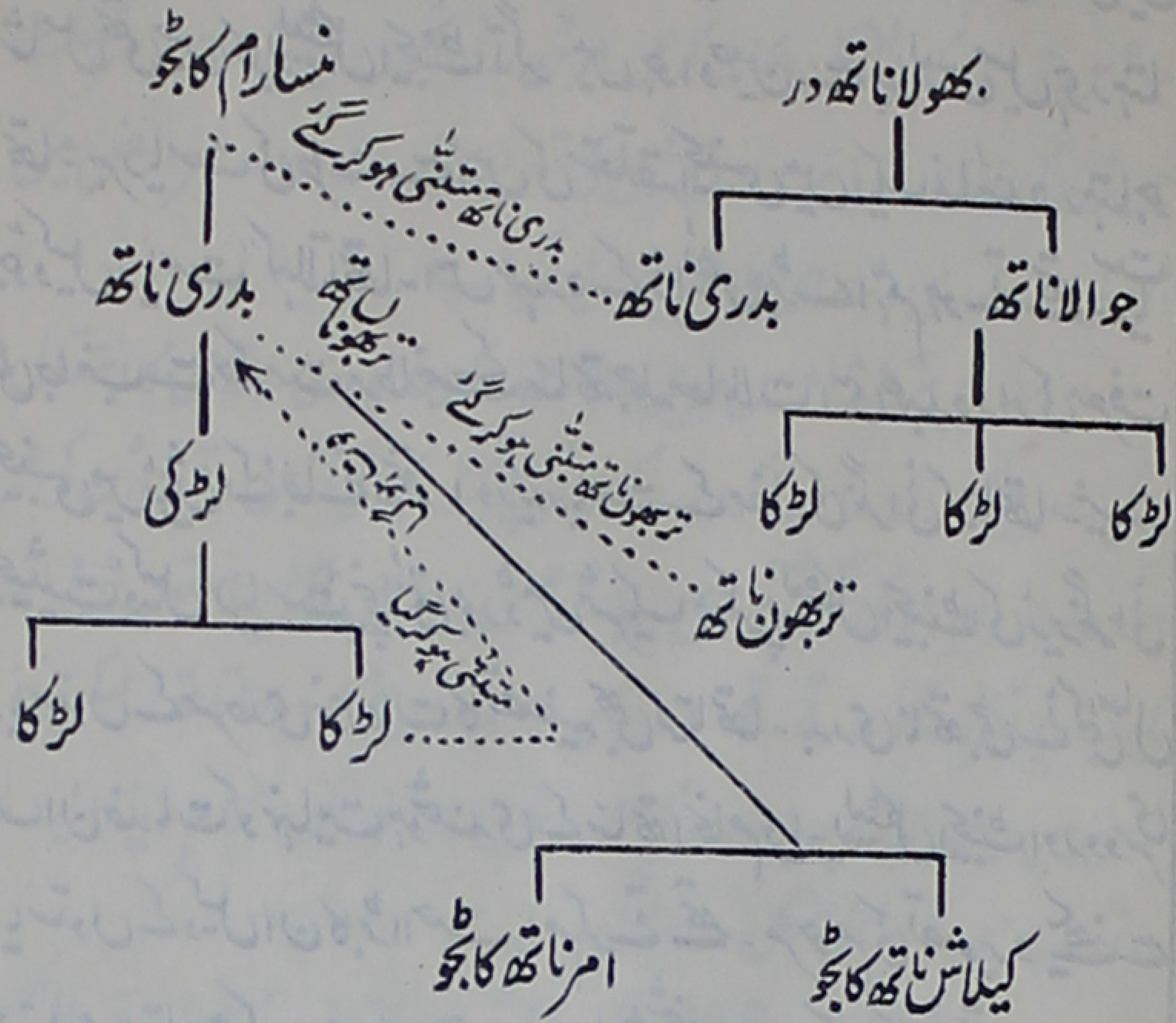
بچہ کو لینے سے انکار کرتی رہیں۔ مگر بچہ کی ماں جا چکی تھیں اور جو لوگ آس پاس موجود تھے اُنھیں اس معاملہ میں مطلق کوئی اختیار نہ تھا۔ بدری ناتھ جی کی بیوی چونکہ ایک لڑکے کا داغ اُٹھا چکی تھیں لہٰذا دوبارہ کسی کے لڑکے کو گود لینے کی طرف اُن کا دل نہیں بڑھتا تھا۔ اُدھر جوالا ناتھ جی کی بیوی نے مصمّم ارادہ کر لیا تھا کہ بچہ کو واپس نہ لیں گی۔ یہ انکار و اصرار آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ آخر جوالا ناتھ جی کی بیوی کی جیت ہوئی اور بدری ناتھ جی کی بیوی بچہ کو گود لینے پر مجبور ہو گئیں۔ یہی میرے والد تربھون ناتھ کاٹجو تھے۔

قدیم ہندو خاندانوں میں دیورانیوں جٹھانیوں کے ایثار و محبت کا یہ واقعہ اور بھی قابل قدر ہو جاتا ہے جب ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس بے بہا تحفہ کے پیش کئے جانیکا سبب صرف دلوں کا خلوص تھا۔ ورنہ جہانتک مال و دولت کا سوال ہے کاٹجو خاندان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ سامنے کے صفحہ پر قارئین کتاب کی دلچسپی کے لئے ایک شجرہ دیا جاتا ہے جس سے ان خاندانی رشتوں کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

تعلیم و تربیت

بچپن میں والد صاحب کی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ ہو سکا۔ اوّل تو جاورہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں کوئی اسکول نہ تھا۔ دوسرے اس زمانہ میں انگریزی تعلیم کا زیادہ چرچا بھی نہ تھا۔ فارسی سرکاری زبان تھی۔ شرفاء اپنے بچوں کے لئے کسی مولوی صاحب کو رکھ لیتے تھے۔

شجرۂ خاندان بھولاناتھ در و منسارام کاچو



بدری ناتھ جی کی وفات اور والد صاحب کی ملازمت

بدری ناتھ جی جنھوں نے ان کو گود لیا تھا، ریاست جاورہ کے ایک بڑے ذمّہ دار عہدہ پر مامور تھے۔ انگریزی حکومت کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی نگرانی کے لئے پولیٹکل ایجنٹوں کے ماتحت چند ایجنسیاں قائم کر رکھی تھیں۔ ریاست جاورہ مالوہ کی ایجنسی میں شامل تھی جس کا پولیٹکل ایجنٹ آگر میں جو اوجین سے چالیس میل ہی رہتا تھا۔ ہر ریاست کی طرف سے اُس کی متعلقہ ایجنسی میں ایک نمائندہ رہتا جو "وکیل ریاست" کہلاتا تھا۔ اس عہدہ کے فرائض بڑے اہم ہوتے تھے۔ ریاست کی جانب سے حکومت برطانیہ کے ساتھ جملہ معاملات اسی عہدہ دار کی معرفت ایجنسی میں پیش کئے جاتے تھے اور یہ ریاست کے مفاد کی نگرانی کرتا تھا نیز بحیثیت "وکیل ریاست" پنچایتی بورڈ میں شریک ہوکر پولیٹکل ایجنٹ کی زیر نگرانی ریاستوں کے سرحدی نزاعات کا تصفیہ بھی کرتا تھا۔ بدری ناتھ جی نے کئی سال تک ان خدمات کو نہایت ہوشمندی کے ساتھ انجام دیا۔ پولیٹکل ایجنٹ اور دوسری ریاستوں کے وکیل ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مرحوم کی تصویر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت وجیہہ اور بااثر شخصیت کے مالک تھے۔

والد صاحب کا سلسلۂ تعلیم ابھی جاری ہی تھا کہ اُنھیں ایک عظیم حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی عمر مشکل سے تیرہ سال کی ہوگی کہ بدری ناتھ جی سخت علیل ہوکر

صاحب فراش ہو گئے۔ والد صاحب اپنی کمسنی میں بھی غیر معمولی ذہین، تیز اور ہوشیار تھے، اس لئے غالباً پولیٹکل ایجنٹ کے اشارہ پر نواب صاحب نے انھیں باپ کا قائم مقام مقرر کر دیا۔ آٹھ ماہ تک اُنھوں نے اپنے فرائض کو اس خوبی سے انجام دیا کہ محکمۂ ایجنسی اور ریاست دونوں اُن کے کام سے مطمئن رہے۔ مرحوم کے کاغذات میں سب سے زیادہ بیش قیمت وہ سرٹیفکٹ ہے جو اُس زمانہ کے پولیٹکل ایجنٹ کرنل مارٹن نے انھیں دیا تھا۔ اس سرٹیفکٹ میں اُن کی خداداد ذہانت اور تیز فہمی کی تعریف کیساتھ ادائے فرائض میں اُن کی مستعدی و تندہی کا اعتراف کیا گیا ہے۔

جنوری ۱۸۷۶ء میں طویل علالت کے بعد بدری ناتھ جی کا انتقال ہو گیا۔ اور جبکہ والد صاحب کو ان کے عہدہ پر مستقل کیا گیا اُس وقت اُن کی عمر چودہ سال ۴ ماہ کی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اُس زمانہ میں اکثر ریاستوں میں وراثت کی بنیاد پر تقرر کئے جاتے تھے اور باپ کا عہدہ بیٹے کو دیا جاتا تھا۔ لیکن اتنی کمسنی میں ایسے عہدہ پر مامور ہو کر حسن و خوبی سے فرائض انجام دینا ایسا واقعہ ہے جس کی مثال مشکل سے ملیگی۔

مرحوم ۱۸۷۶ء سے ۱۹۴۵ء تک جبکہ اُن کا انتقال ہوا مسلسل ستّر سال تک ریاست کی ملازمت میں رہے۔ اتنی طویل اور مسلسل خدمت بھی اپنی نظیر آپ ہی ہے ہمارے خاندان میں جب کبھی ملازمت پر بات چیت ہوتی تھی تو مرحوم کی اس کم عمری کی

ملازمت کو بطورِ مثال کے پیش کیا جاتا تھا۔

والد صاحب خود بھی اُس زمانہ میں جبکہ میں اور میرے بھائی کالج میں تعلیم پاتے اور تیرہ چودہ سال سے زائد کے ہو جانے پر بھی گھر میں ابھی بچے ہی خیال کئے جاتے تھے کبھی کبھی اپنی کم عمری کی ملازمت کا حال بیان کر کے فرمایا کرتے تھے کہ "ہم نے تو اس عمر میں وکیل ریاست جیسے ذمہ دارانہ عہدے کے فرائض بھی انجام دینا شروع کر دئے تھے"۔

واقعی ایسے عظیم الشان انسان کے سامنے ہم لوگ بہت حقیر معلوم ہوتے تھے۔ اور اس کا ہمیں پورا احساس ہوتا تھا۔ اُن کی عمر کے چوراسی سال میں سے پچاس برس باقاعدہ ملازمت میں صرف ہوئے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے ریاست کے ہر قسم کے عہدوں پر کام کیا۔ سول جج، افسرِ ضلع، مہتمم سائر اور منتظم بندوبست رہے۔ عرصہ تک وزیر ریاست کے پرسنل اسٹنٹ رہے۔ آخر میں ریونیو سکریٹری کی حیثیت سے اسٹیٹ کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ اس بات پر سب کو اتفاق ہے کہ اُنھوں نے ہر عہدہ کی خدمات قابلیت کیساتھ انجام دیں۔

مُطالعہ اور وسعت معلومات

قدرت کی طرف سے وہ دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں لیکر آئے تھے۔ اُن کی باقاعدہ درسی تعلیم کم ہوئی تھی، لیکن کثرت مطالعہ کے ذریعہ انھوں نے یہ کمی بہت جلد پوری کر لی تھی اور باقی عمر اپنے علم و معلومات میں برابر اضافہ

ہی کرتے رہے۔ فارسی کی پوری دستگاہ بہم پہنچائی۔ اُردو کا طرز تحریر شُستہ اور ادیبانہ تھا۔ ریاست کے پیچیدہ مسائل کے مسودات وہ بڑی قابلیت سے تیار کرتے تھے۔

وہ بڑے باخبر انسان تھے۔ دنیا کے عام حالات و واقعات کا اُنھیں کافی علم تھا۔ اُن کی عملی زندگی کے ستر سالہ دور میں مشکل سے کوئی دن ایسا ہوا ہوگا جب اُنھوں نے اخبارات کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ انگریزی وہ بالکل نہ جانتے تھے اُردو اخبار پڑھ کر ہندوستان اور دوسرے ممالک کے حالات سے آگہی حاصل کرلیتے تھے۔ حالات زمانہ سے باخبر رہنے اور اپنی معلومات بڑھانے کا اتنا ہی زیادہ شوق اگر کسی دوسرے کو تھا تو وہ میری محترمہ والدہ کو تھا۔

پنشن

سنہ ۱۹۲۵ء میں میرے چھوٹے بھائی کا ریاست کے ریونیو سکریٹری کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ اُس وقت نواب صاحب نے والد صاحب کی پوری تنخواہ بطور پنشن کے مقرر کر کے ملازمت سے سبکدوش کر دیا۔ لیکن والد صاحب کی قابلیت کا انھیں اس درجہ اعتراف تھا اور دونوں کے تعلقات اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ نواب صاحب کسی حالت میں اُنھیں اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا باضابطہ طور پر تو اگرچہ پنشن ہو گئی تھی، لیکن ریاست کی اکثر مہمات والد صاحب ہی کو سرانجام دینا پڑتی تھیں۔

نواب افتخار علی خاں

سنہ ۱۸۷۰ء میں جب والد صاحب مرحوم ریاست کی

ملازمت میں داخل ہوئے تھے اُس وقت نواب اسمٰعیل خاں حکمراں تھے ۱۸۹۰ء میں نواب صاحب کا انتقال ہوا اور اُن کے فرزند نواب افتخار علی خاں رئیس ہوئے لیکن یہ کمسن تھے۔ لہٰذا انتظام ریاست کی انجام دہی اُن کے خالو یار محمد خاں صاحب کا مدار ریاست کے سپرد ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں نواب صاحب کو ریاست کے پورے اختیارات مل گئے۔ اور دو سال بعد جب یار محمد خاں صاحب کا انتقال ہوا تو نواب صاحب نے جملہ انتظامات براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

والد صاحب کے نواب صاحب سے تعلقات

نواب افتخار علی خاں کی ولادت ۱۸۸۳ء میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے وہ عمر میں مجھ سے چار سال بڑے تھے۔ والد صاحب کے تو وہ گودوں کے کھلائے ہوئے تھے اور اُنھیں کے سامنے پل پوس کر بڑے ہوئے تھے۔ والد صاحب کو اُن سے بڑی محبّت تھی، اور نواب صاحب بھی اس محبّت کی قدر کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو راقم الحروف کا بڑا بھائی کہتے اور بڑے بھائیوں ہی کی طرح شفقت و محبّت کا برتاؤ کرتے تھے نواب صاحب کے ساتھ والد مرحوم کی محبّت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اگر کبھی اُن کے سامنے ایسا موقع آجاتا کہ میرے اور افتخار علی خاں دونوں میں سے کسی ایک کے بچا لینے کا سوال پیدا ہوتا تو یقین ہے کہ افتخار علی خاں کی خاطر وہ مجھے قربان کر دینا گوارا کر لیتے۔ نواب صاحب بھی اسے محسوس کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ

مرحوم کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

یار محمد خاں صاحب کے انتقال کے بعد والد صاحب کے اثر و رسوخ میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کی تنخواہ بھی دوگنی یعنی ڈیڑھ سو سے تین سو روپے ماہوار ہو گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نواب صاحب جس قدر و احترام کا برتاؤ اُن کے ساتھ فرماتے تھے، وہ اہل دربار میں سے کسی اور کو نصیب نہ تھا۔

قیام جاورہ کیلئے نواب صاحب کا اصرار

والد صاحب کی پنشن بھی عجیب قسم کی پنشن تھی۔ بظاہر تو وہ ہر طرح آزاد تھے اور جاورہ سے باہر جہاں چاہتے آجا سکتے تھے۔ مگر نواب صاحب کے مخلصانہ برتاؤ نے اُنھیں زمانۂ ملازمت سے بھی زیادہ پابند بنا دیا تھا۔ سردیوں کے موسم میں وہ میرے پاس الٰہ آباد آکر رہا کرتے تھے۔ ادھر نواب صاحب کو دم بھر کے لئے بھی اُن کی دوری منظور نہ تھی۔ لہٰذا ایسے موقعوں پر انھیں وہ روکتے تو نہ تھے مگر کوئی بات ایسی کہہ دیتے تھے جس سے والد صاحب کا قلب بیحد متاثر ہو جاتا تھا۔ نواب صاحب کا ایک مخلصانہ جملہ ان پر ایسا اثر کرتا تھا۔ کہ ایکہزار سرکاری احکامات سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ والد صاحب سے اکثر کہا کرتے تھے کہ "پنڈت جی! جاورہ میں آپ کے قیام سے مجھے ہر طرح کا اطمینان اور دلی مسرت رہتی ہے۔ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں میرا ایک سچا بہی خواہ

اور ہمدرد اور مشیر موجود ہے۔ لیکن آپ کے باہر چلے جانے سے میں تنہائی محسوس کرنے لگتا ہوں"۔ ایک مرتبہ ۱۹۳۵ء میں جب والد صاحب نے حسب معمول میرے پاس آنے کے لئے نواب صاحب سے اجازت چاہی تو نواب صاحب نے فرمایا "پنڈت جی! آپ تشریف تو لئے جارہے ہیں، مگر براہ کرم ذرا واپسی بھی جلدی فرمائیے گا۔ مجھے آپ کی جدائی بہت شاق گزرتی ہے"۔

نواب صاحب کے اس ارشاد کا مرحوم کے دل پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے ارادہ کرلیا کہ اب اس کے بعد جاورہ کبھی نہ چھوڑوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اپنی زندگی کے بقیہ نو برس میں انھوں نے جاورہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔

یہ ضروری نہ تھا کہ وہ نواب صاحب سے روزانہ ملاقات کریں۔ آٹھویں دسویں دن محل پر ہو آتے تھے۔ اور کبھی کبھی اس میں بھی ناغہ ہوجاتا تھا۔ مگر کیا مجال کہ نواب صاحب کا آدمی روزانہ اُن کی خیریت دریافت کرنے مکان پر نہ آتا ہو اور خیریت مزاج کی اطلاع نواب صاحب کو نہ پہنچاتا ہو۔ اگر والد صاحب کی طبیعت ذرا بھی خراب ہوجاتی تھی تو نواب صاحب بڑی بیقراری کے ساتھ دمبدم خیریت دریافت کراتے اور اپنے معالج خاص کو علاج کے واسطے مامور کرتے تھے۔ اس دوران میں اگر کوئی پریشان کن بات سن لیتے تھے تو بذات خود مکان پر تشریف لے آتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جب والد صاحب کا انتقال ہوا تو نواب صاحب نے منادی کرادی کہ اس حادثۂ عظیم کی ماتم پرسی کرنے کیلئے

لوگ بجائے کیلاش ناتھ کے میرے پاس آئیں۔ کیونکہ سرگباشی کے بڑے فرزند کیلاش ناتھ نہیں بلکہ میں ہوں۔

ادب واحترام

علاوہ ذاتی ملاقاتوں کے نواب صاحب اور والد صاحب کے درمیان سلسلۂ خط وکتابت بھی برابر جاری رہتا تھا۔ نواب صاحب جو خطوط اُنھیں لکھا کرتے تھے اُنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرحوم کا ادب اپنے باپ کے برابر کرتے تھے۔ اور ان کو مرحوم کے ساتھ ویسی ہی محبّت تھی جو کسی بیٹے کو اپنے باپ سے ہونی چاہیئے۔ نواب صاحب کے سامنے جب کبھی ریاست کا کوئی بڑا اہم پیچیدہ معاملہ آتا تو وہ والد صاحب ہی سے مشورہ کرتے اور اُنھیں سے مسودات بھی تیار کراتے تھے۔

اِس وقت ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح جاورہ کا بھی وجود بحیثیت دیسی ریاست کے باقی نہیں رہا ہے اور اُسے "مدھ بھارت یونین" میں ضم کردیا گیا ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ والد صاحب اور نواب افتخار علی خاں دونوں جاورہ کے یہ دن دیکھنے کے لئے باقی نہیں رہے۔ کیونکہ والد صاحب کو نواب صاحب کی ذات اور ان کی ریاست سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ ریاست کے اس طرح کے خاتمہ پر ان کو ناقابلِ برداشت صدمہ ہوتا۔

اخلاق وعادات

پاکیزہ کردار نواب افتخار علی خاں میں بحیثیت ایک انسان اور بلحاظ فرمانروا ہونے کے کچھ خامیاں ضرور تھیں۔ مگر اُن میں ایک وصف ایسا تھا جس نے اُن کی تمام خامیوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ یہ کہ رشوت ستانی اور افسروں وماتحتوں کی اُن کوتاہیوں کے وہ جانی دشمن تھے جن کا اثر ریاست کے انتظامی امور پر پڑسکتا تھا۔ والد صاحب کا دامن ان تمام آلائشوں سے پاک تھا۔ میرے خیال میں غالباً یہی وجہ تھی کہ نواب صاحب ان پر کامل اعتماد کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں افسروں اور ماتحتوں کی اس قسم کی خامیاں کچھ زیادہ معیوب نہ سمجھی جاتی تھیں، نہ انھیں ان کمزوریوں پر قابل ملامت ٹھہرایا جاتا تھا، نہ عوام میں انگشت نمائی کیجاتی تھی۔ ان حالات میں والد صاحب کے پاکیزہ کردار کی مثال ایسی تھی گویا کہ مکدر فضا پر ایک روشن ستارہ چمک رہا ہو۔ ان کے اقتدار اور وسیع اختیارات کے زمانہ میں (اگرچہ وہ ایک چھوٹی سی ریاست کے اندر محدود تھی) کردار کی آزمائش کے اکثر وبیشتر موقع آتے رہتے تھے۔ مگر طوفانی موجوں میں بھی اُن کی مضبوط شخصیت چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہتی تھی۔ ایک مرتبہ نہایت رنج وغم کے لہجہ میں مجھ سے فرمایا کہ "میں نے بیس سال کی عمر میں کسی فریق مقدمہ یا کسی اور شخص سے دو چھوٹی چھوٹی رقمیں جن کی مجموعی تعداد دو سو روپیہ سے زیادہ نہ تھی قبول کرلی تھیں۔ مگر

اس کے بعد ہی ضمیر نے ایسی ملامت کی کہ پھر تا زندگی ناجائز طور سے ایک پیسہ بھی لینا اپنے اوپر حرام سمجھا۔ حالانکہ اُس زمانہ میں میری تنخواہ بہت کم تھی"۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ "آج بھی جب اس لغزش کا خیال آتا ہے تو دل کانپ جاتا ہے اور اتنی ندامت ہوتی ہے کہ اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے"!

دیانتداری

وہ دیانتداری کے اتنے سخت پابند تھے کہ سرکاری اسٹیشنری میں سے کاغذ یا پنسل کا ایک ٹکڑا تک گھر میں آنا ہم لوگ نہ جانتے تھے۔

اُن کی یہ خوبیاں لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئی تھیں۔ ان کی سیرت کی پاکیزگی اور اصول پرستی کی عام شہرت تھی اور سب لوگ ان کی عزت و وقعت کرتے تھے اور وہ خود بھی اپنے ان اوصاف سے اچھی طرح باخبر تھے۔

فخر و خودداری

مجھے یہ بات انصافاً کہنا پڑتی ہے کہ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ مرحوم میں عجز و انکسار کا مادہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ افسروں، ماتحتوں اور دوستوں میں اپنی اصول پرستی، دیانتداری اور راستبازی کا ذکر فخریہ طور سے کرتے تھے۔ ان اوصاف کے احساس نے ان کی شخصیت کو خود ان کی نگاہ میں بہت بلند کر دیا تھا۔ اور اسی چیز نے ان کے جذبۂ خودداری کو بہت بڑھا رکھا تھا۔ ان کی طبیعت اس قدر حسّاس ہو گئی تھی کہ ایک دفعہ کسی غلط فہمی کی بنا پر کامدار یار محمد خاں صاحب نے اُنھیں یہ لکھدیا کہ "سرکاری کاموں میں مجھی آپ سے وہ مدد نہیں مل رہی ہے جس کی مجھ کو توقع تھی" تو والد صاحب نے بلا کسی پس و پیش کے

فوراً اس تحریر کے ساتھ اپنا استعفیٰ پیش کر دیا کہ "میں امکانی محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہا ہوں اگر کامدار صاحب اس پر بھی میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں تو ایسے شخص کا ریاست میں رکھا جانا بیکار ہے"!!

یہ فیصلہ والد صاحب نے اُس وقت کیا تھا جبکہ ہمارا کنبہ کافی بڑا ہو گیا تھا اور مرحوم پر اخراجات کا بار بہت بڑھا ہوا تھا۔ اگر استعفیٰ منظور ہو جاتا تو اُنھیں بہت دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا، مگر اُنھوں نے اپنی خودداری کے مقابلہ میں تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ شاید کامدار صاحب کو لکھتے وقت یہ خیال نہ رہا تھا کہ اُن کا مخاطب کیسا شخص ہے۔ بہر حال اُنھیں بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اُنھوں نے دوستانہ اور برادرانہ طریقہ سے والد صاحب کو استعفاء پیش کرنے پر تنبیہہ کی اور اس بات کا بڑا شکوہ کیا کہ ایک ذراسی بات کا اتنا اثر لیا گیا۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ دل و دماغ کی جیسی صلاحیتیں اُن کو ملی تھیں وہ ایک تنگ دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئیں اور ان کی ساری عمر ایک چھوٹی سی ریاست کی تنظیم و اصلاح میں صرف ہوئی۔ اگر ان کو وسیع میدانِ عمل مل جاتا اور زیادہ سازگار حالات میسر آجاتے تو اِن صلاحیتوں کو بر سرِ کار لانے میں وہ اپنے حوصلے دکھاتے اور ترقی کی منزلوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ اس کا اُنھیں بخوبی احساس تھا اور وقتاً فوقتاً اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔

اصابتِ رائے | وہ گھر میں، گھر سے باہر، دوست و احباب کی محفلوں میں،

سرکاری جلسوں میں اور محل پر نواب صاحب سے ہر موضوع پر گفتگو کرتے،
زیر بحث مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے، اُس کے مخالف اور موافق دلائل
زیر بحث لاتے، اس کے مفید اور مضر نتائج کی تشریح کرتے اور پھر ہر بات
کے متعلق نہ صرف اپنی رائے ظاہر کرتے بلکہ پورے یقین کے ساتھ آخری
حکم لگاتے تھے۔ ڈاکٹر جانسن کی طرح وہ اپنے خیال یا رائے کی مخالفت یا تردید
کو ہرگز برداشت نہ کرسکتے تھے۔ وہ لوگوں کے قصوروں کو آسانی سے نظر انداز
نہیں کرتے تھے اور جب کبھی ایسا موقع آجاتا تو صاف صاف اپنے خیال کا
اظہار کردیتے تھے۔ اخبار و کتب بینی نے ان کی معلومات میں اس قدر وسعت
پیدا کردی تھی اور حادثات زمانہ ہو وہ اتنے زیادہ قریب رہتے تھے کہ بیشتر
امور میں اُن کی رائے صحیح ثابت ہوتی تھی۔ اسی علم و تجربہ کی بناء پر وہ ہر ایک
معاملہ میں خواہ وہ اہم ہو یا غیر اہم اور خواہ اس کا تعلق حکومت کی پالیسی ہی
سے کیوں نہ ہو بلا تامّل اپنی رائے کا اظہار کردیا کرتے تھے۔ اُنکی پختگیٔ طبیعت اور
استقلال مزاج کا یہ عالم تھا کہ جب کسی امر میں ایک بار وہ کوئی رائے قائم کرلیتے
تو وہ اٹل ہوتی تھی۔

خود اعتمادی

۱۸۷۵ء میں بدری ناتھ جی کے قبل از وقت انتقال کرجانے
سے گھر اور باہر کے سارے جھگڑے اُن کے سر آگئے تھے اور
خاندان کا تمام بار اُن کے کندھوں پر آپڑا تھا۔ اسی زمانہ میں اُنھیں ملازمت بھی

کرنا پڑی جس کے فرائض اور ذمہ داریاں معمولی نہ تھیں۔ گھر میں کوئی ایسا بزرگ موجود نہ تھا جو اُن پر دباؤ یا اثر ڈالتا یا صلاح ومشورہ سے ان کی رہنمائی کرتا۔ ہر کام اُنھیں اپنی ہی سمجھ اور کوشش سے انجام دینا پڑتا تھا۔ پھر اُنکی کوششیں کامیاب بھی ہوتی تھیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں خود اعتمادی کا مادّہ بہت بڑھ گیا اور اپنی رائے کی صحت پر اتنا وثوق ہوگیا تھا کہ ہر کام میں وہ کتنا ہی ہمّت طلب کیوں نہ ہو بے جھجک ہاتھ ڈالدیتے تھے۔

اصلاحی وتعمیری کاموں سے دلچسپی

دیہات سدھار کے کاموں سے اُنھیں بڑی دلچسپی تھی۔ اسی طرح پھولوں کے چمن اور پھلوں کے باغات نصب کرانے اور دودھ دہی کے کارخانے قائم کرنے میں خاص حصّہ لیتے تھے۔ تعمیرات کے کام سے بھی خاص شغف تھا۔ غرض کہ دنیا کے اکثر مفید کاموں میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور رکھتے تھے۔ والد صاحب کی ان ذاتی خصوصیات کی وجہ سے ان میں اور والدہ مرحومہ اور ہم بچوں میں ایک عجیب کشمکش رونما ہوگئی تھی۔

اِزدواجی زندگی

۱۸۶۸ء میں جبکہ مرحوم کی عمر صرف سات سال کی تھی اُنکی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی جو عمر میں اُن سے دو سال بڑی تھی۔ بڑے ہونے پر یہ والد صاحب سے زیادہ ذکی اور ذہین ثابت ہوئیں۔ فطری فہم وفراست اور کردار کی بلندی میں بھی ان کا درجہ بڑھا ہوا تھا۔ اُن میں

جستجو اور علم کا ذوق بھی والد صاحب سے کہیں زیادہ تھا۔ والد صاحب کی طرح اُنھوں نے اپنی زندگی خود بنائی تھی۔ پڑھنا لکھنا بھی ذاتی شوق سے سیکھا تھا۔ میں آٹھ ماہ کا تھا کہ میری دادی کا انتقال ہوگیا۔ اُن کے بعد اب میرے والد اور والدہ ہی گھر کے بزرگ تھے۔ والد صاحب کی طرح ان کو بھی صلاح و مشورہ دینے والا کوئی بڑا بوڑھا باقی نہ رہا تھا۔ ہر کام اُنھیں اپنی ہی سمجھ بوجھ سے کرنا پڑتا تھا۔

اختلاف طبائع

مجھے یقین ہے کہ والد صاحب کو میری والدہ کی اِس ذہنی برتری کا کافی احساس تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عام معلومات یا کسی معاملہ پر بحث کی صورت میں وہ والدہ مرحومہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے، اس لئے بعض اوقات جب لاجواب ہوجاتے تو جھنجلا کر جاؤ بیجا طور سے وہ اس طرزِ عمل کو اختیار کرتے جس کا عام طور پر گھریلو زندگی میں شوہر اپنے آپ کو حقدار خیال کرتا ہے۔ جب میں ذرا ہوشیار ہوا تو میں نے دیکھا کہ والدہ صاحبہ ان کی موقع بے موقع تیز باتوں سے رنجیدہ رہا کرتی تھیں۔ یہ بھی عجیب اتّفاق تھا کہ اُس زمانہ میں اُن دونوں میں سے ایک میں بھی خوش طبعی کا شائبہ تک نہ پایا جاتا تھا۔ دونوں ہر وقت حد درجہ روکھے پھیکے رہا کرتے تھے۔ والد صاحب کی طبیعت اگر کبھی خوش طبعی کی طرف آتی بھی تھی تو وہ گھر سے باہر خاص خاص احباب کی صحبتوں تک ہی محدود

رہتی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ خانگی زندگی یا اہل وعیال تک اُس کی کوئی جھلک آسکے طبیعتوں میں اسی مذاق کے نہ ہونیکی وجہ سے آپس میں بحث وتکرار کی نوبت آتی رہتی تھی۔

دو نظریئے

منجملہ اور اسباب کے باہمی اختلاف کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ والدہ صاحبہ کا یہ پکا عقیدہ تھا کہ قدرت نے مرد اور عورت کو ہر طرح برابری کا درجہ دیا ہے۔ وہ کبھی یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھیں کہ مرد کو حکم دینے اور عورت کو تعمیل کرنے کے واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ زندگی کی مہم میں عورت اور مرد کی مثال دو ساتھیوں کی سی ہے۔ مگر والد صاحب کا نظریہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اسی کے ساتھ وہ اس بات کو بھی خوب سمجھتے تھے کہ بحث ودلیل کے ذریعہ والدہ صاحبہ کو قائل کر دینا کچھ آسان کام نہیں۔ لہذا اس سے گریز کر کے وہ صرف اس بات پر زور دیتے تھے کہ محض شوہر ہونے کی بنا پر اُنھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ گھر کی ساری مشینری صرف ایک اُن کے اشارہ پر حرکت کرتی رہے۔ اور اُن کا ہر ایک حکم واجب التعمیل تسلیم کیا جائے

نانا کا انتقال

سنہ ۱۸۹۵ء میں میرے نانا کی وفات ہو گئی۔ ہندوؤں میں لڑکی کے لئے اس کے باپ کا گھر جائے پناہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی موجودگی سے ہر لڑکی میں خودداری کا احساس بیدار رہتا ہے کیونکہ اسے یہ اطمینان رہتا ہے کہ اگر سسرال میں کوئی نازیبا سلوک ہوا تو اس کے لئے

ایک عافیت کی جگہ موجود ہی۔ لیکن اس پناہ سے محروم ہو کر وہ اپنے آپ کو بہت بے سہارا محسوس کرنے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک سمجھدار شوہر کے لئے یہ بات اور زیادہ ضروری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بول چال، رہنے سہنے اور عام برتاؤ میں نہایت نرمی اور ہمدردی کا برتاؤ کرے۔ لیکن میرے نانا کے انتقال سے والد صاحب کے طرزِ عمل پر اس قسم کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اچھے شوہر کا وصف

مزاجوں کے اس اختلاف کے باوجود والدہ صاحبہ کسی نہ کسی طرح وقت گزارتی رہیں۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے دل کا یہ راز مجھ سے بھی ظاہر کیا۔ اُنھوں نے فرمایا "تم جانتے ہو کہ اتنے ذہنی اختلافات کے باوجود میں تمھارے والد صاحب کے ساتھ کیوں نباہ کئے جا رہی ہوں"؟ پھر خود ہی فرمایا "عورت اپنے شوہر کی ہر بات برداشت کر سکتی ہے اور ہر بُرا بھلا برتاؤ گوارا کر لیتی ہے صرف اگر شوہر اُس کے ساتھ بیوفائی نہ کرے۔ اگر شوہر وفادار رہے تو عورت اُس کی ہر سخت و سست بات کو نظر انداز کر دیگی"۔

اِس معیار پر والد صاحب بالکل پورے اترتے تھے۔ اُن کی سیرت کا اخلاقی پہلو نہایت ہی روشن تھا۔ اُن کی پاک طینت اور پارسائی ایک شریف شوہر کے لئے ایک نمونہ تھی۔ والدہ صاحبہ گھر کی ملکہ تھیں۔ والد صاحب کی پوری تنخواہ اُن کے ہاتھ میں آتی تھی اور وہ اُسے جس طرح چاہتی تھیں صرف

کرتی تھیں۔ وہ گھریلو زندگی اور گھر کے سفید و سیاہ کی مالک تھیں۔ ایک دفعہ اُنھوں نے فرمایا کہ "جب کبھی مجھے تمھارے والد صاحب کی کسی بات سے رنج پہونچتا ہے تو ساتھ ہی مجھے ان کی خوبیوں اور اعلیٰ انسانی صفات کا بھی خیال آجاتا ہے۔ میں اپنا دل میلا کرنے کے بجائے یہ سوچنے لگتی ہوں کہ ایسا پارسا اور پاک باطن شوہر ملنا ہی میری سب سے بڑی خوش نصیبی ہے یہ سوچ کر اُن کی کڑوی کسیلی باتوں کو برداشت کرلیتی ہوں"۔ ایسی بدمزگیاں ہی محض طبیعتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوجاتی تھی ورنہ ویسے والد صاحب بڑے محبت کرنے والے اور باوفا شوہر تھے۔

میری وکالت

۱۹۰۸ء میں جب میں نے یو۔پی میں وکالت شروع کی تو اس کا اثر میرے والدین کے خیالات پر دو طرح سے پڑا۔ اس وقت والدہ صاحبہ کی عمر پچاس برس کی ہوچکی تھی اور اس خیال نے کہ اب اُن کے بیٹے کا اپنا علیحدہ گھر ہوگیا ہے جہاں وہ ماں ہونیکی حیثیت سے بے تکلّف ہر وقت آجاسکتی ہیں اُن میں آزادیٔ رائے خودمختاری اور اطمینان کا احساس اور بھی تیز کردیا تھا۔ اسی کے ساتھ وقت اور عمر کے تقاضے نے والد صاحب کے مزاج مین بھی کافی نرمی اور برداشت پیدا کردی تھی۔ اُنھوں نے ان تبدیلیوں کا بھی اندازہ کرلیا تھا جو میرا علیحدہ گھر ہوجانے کی وجہ سے خاندان میں ہونا لازمی تھیں۔ چنانچہ اب اگر کسی بات پر

والدہ مرحومہ سے بحث چھڑ جاتی تو حالات کی اس تبدیلی کا لحاظ کر کے والد صاحب کبھی یہ کوشش نہ فرماتے تھے کہ میری ہی بات اونچی رہے۔

والدین کی خشک مزاجی کا اثر

میرے والدین کی بڑھی ہوئی سنجیدگی اور خشک مزاجی کا اثر اولاد پر بہت بُرا پڑا۔ اُن دونوں میں سے ایک بھی شگفتہ مزاج نہ تھا۔ والدہ صاحبہ کو گھر کے دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی تھی۔ کھانا پکانے، سینے پرونے اور اس کے علاوہ گھر گرہستی کے ہزار طرح کے کام کاج میں ہر وقت مصروف رہتی تھیں۔ والد صاحب کو سرکاری کاموں سے مہلت نہ تھی۔ وہ روزانہ ٹھیک گیارہ بجے دفتر چلے جاتے اور چار بجے واپس آتے تھے۔ شام کو وقت کھانا کھانے کے آدھ گھنٹہ بعد پھر وہ کا مدار صاحب کے یہاں تشریف لیجاتے تھے جہاں دوست واحباب کی مجلس میں دفتری زندگی کی کوفت دور کر کے گیارہ بجے رات کو اُس وقت تشریف لاتے جب ہم لوگوں کو سوئے ہوئے ایک پہر سے زیادہ ہو چکا ہوتا تھا۔ ہم لوگوں سے ان کی بات چیت نہونے کے برابر تھی کیونکہ وہ اولاد کے ساتھ گھلنے ملنے کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اُس وقت اُن کا فلسفۂ زندگی یہ تھا کہ والدین کو اپنی بچوں کو لاڈ پیار میں ڈالنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہی چیز اولاد کے بگڑنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ان اسباب سے میری بچپن کی زندگی پیار اور محبت سے محروم رہی۔ اس کے علاوہ اُس زمانہ کی

قدیم ہندوخاندانوں کی تہذیب یہ تھی کہ بزرگوں کے سامنے نوعمر والدین کا اپنی اولاد کو گود میں لیکر پھرنا یا کھلانا وغیرہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہ فرض نانا، نانی اور دادا، دادی کا ہوتا تھا اور یہ بزرگ جاؤ بیجا ناز برداری کر کے پوتا پوتی، نواسا نواسی کو بگاڑنے کا سبب ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے میں اپنے دادا، دادی، نانا، نانی کے سایۂ شفقت سے بچپن ہی سے محروم تھا۔ مجھے خبر بھی نہ تھی کہ ان مقدس بزرگوں کی محبت و شفقت کیا چیز ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے بچپن میں نیز بعد کے زمانہ میں والدین اور دوسرے بزرگوں کے لاڈ پیار اور ناز برداریوں کا کوئی تجربہ نہ ہو سکا۔ یہ بدقسمتی صرف میرے حصہ میں نہیں آئی تھی بلکہ میرے چھوٹے بھائی بہن بھی اس میں شریک تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے ساتھ اتنی شدت نہیں ہوئی۔ میری بڑی بہن کو والد صاحب کی سنجیدگی ہم سب سے زیادہ برداشت کرنا پڑی۔

میری بہن اور میں دونوں ان سے کانپتے ہی رہتے تھے۔ ہمیں کبھی ان کے سامنے جانیکی ہمت نہ ہوتی تھی، لیکن جب وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ گئے تو طبیعت میں خاصی نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن جو ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئی تھی، جہانتک کہ باپ کی شفقت کا تعلق ہے وہ بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت ثابت ہوئی۔

میری شادی

۱۹۰۵ء میں میری بیوی بیاہ کر گھر لائی گئیں۔ انکی عمر

چودہ سال کی تھی۔ اب والد صاحب کا جوش پدری جسے اُنھوں نے برسوں دبا دبا کر رکھا تھا طوفان کی طرح اُمنڈ آیا۔ جس دن بہو گھر میں آئی اُسی دن سے مرحوم نے ان پر شفقت و محبت کی بوچھار کر دی۔ وہ اُن کے لئے تحفے تحائف خرید کر لاتے، اُن سے گھنٹوں بات چیت کرتے، ان کے ساتھ تاش کھیلتے اور ان کو اُردو پڑھانا شروع کیا۔ عمر کی اس منزل پر پہنچکر مرحوم کو یہ تجربہ ہو گیا تھا کہ گھریلو زندگی میں میل جول رہنے ہی کا نام حقیقی مسرّت ہے اور انسان اپنے بال بچوں ہی سے ہنس بول کر غم غلط کر سکتا ہے۔

والد صاحب کی پوتے پوتیوں سے محبت

کشمیری پنڈتوں میں یہ رواج چلا آتا ہے کہ جب دلہن بیاہ کر آتی ہے تو سسرال کی طرف سے اُسے کوئی خطاب دیا جاتا ہے۔ میری بیوی کو لکشمی رانی کا خطاب دیا گیا۔ میرے والدین اُنھیں اسی خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔ خدا کے فضل سے والد صاحبؒ کے بہت سے پوتا پوتی اور نواسی نواسے تھے۔ اور ان کو ہر ایک سے محبت تھی۔ لیکن جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام یوں تو اپنے سارے ہی حواریوں سے محبت فرماتے تھے مگر سینٹ پیٹر کے ساتھ ان کو خاص اُنس تھا اسی طرح والد صاحب کو لکشمی رانی کے بچّے زیادہ عزیز تھے۔ میرے یہاں اولاد کا سلسلہ سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد سے شروع ہوا۔ والد صاحب کا ان بچّوں میں ملکر بیٹھنا اور ان کے ساتھ ہنسنا کھیلنا ایک عجیب منظر ہوتا تھا اور اس

خصوصیت میں اپنے لڑکپن کو یاد کر کے مجھے ان بچوں پر رشک آتا تھا۔ مرحوم کو لکشمی رانی سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ جس کی مثال صرف ہندو خاندانوں میں مل سکتی ہے۔ وہ انھیں اپنی بیٹیوں سے زیادہ عزیز ہو گئی تھیں چنانچہ سنہ ۱۹۴۴ء میں جب والد صاحب سے صرف تین ماہ قبل وہ اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو اس سانحہ سے والد صاحب کا دل ٹوٹ گیا۔ اور وہ بھی جلد آخرت کو سدھار گئے۔ مرحومہ کی سمجھ بوجھ، بردباری اور خانہ داری کا فطری سلیقہ، خاصکر رنج و غم میں صبر و سکون اور تکلیف و پریشانی کے موقعوں پر ہمت و استقلال کی خوبیوں نے انھیں والد صاحب کی نگاہ میں بہت قابل قدر بنا دیا تھا واقعی لکشمی رانی ہمارے یہاں لکشمی ہی بنکر آئی تھیں۔ اُن کے قدم آتے ہی ہمارے کنبہ پر مسرت اور خوشحالی کے دروازے کھُل گئے۔ لیکن میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ یہاں لکشمی رانی کے حالات لکھنا میرا مقصد نہیں ہے۔

جاورہ میں میری ملازمت کا مسئلہ

میرے بزرگوں نے کشمیر سے نکلکر جاورہ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ یہاں سے مجھے اور میری خاندان کو گہرا لگاؤ تھا۔ باہر سے ہمارا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے والد صاحب کا خیال تھا کہ میں بھی اپنے بزرگوں کی طرح اسی ریاست کی خدمت کروں۔ اس لئے سنہ ۱۹۰۷ء میں جب ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان میں کامیاب ہو کر میں وطن لوٹا تو والد صاحب نے بغیر مجھ سے کچھ فرمائے ہوئے ایک درخواست کے ذریعہ

کامدار صاحب کے سامنے میری خدمات پیش کر دیں۔ لیکن کامدار صاحب نے اس پیشکش کے قبول کرنے میں تامّل کیا اور والد صاحب سے یہ کہا کہ "کیلاش ناتھ ابھی کم سن ہیں (اُس وقت میری عمر بیس سال سے بھی کم تھی) ان کے لئے زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ قبل اس کے کہ ریاست کے کسی عہدہ پر مامور کئے جائیں باہر جا کر کچھ تجربہ حاصل کر لیں" اس جواب سے والد صاحب کو تکلیف ہوئی۔ اور اُنھوں نے کامدار صاحب کو لکھا "ملازمت دینا یا نہ دینا تو آپکی رائے پر موقوف ہے۔ البتہ میں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ چڑیا کا بچہ جب ایک دفعہ گھونسلے سے اُڑ جاتا ہے تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ گھونسلے میں پھر پلٹ کر آئے۔ اسی طرح کیلاش ناتھ اگر ایک مرتبہ جاورہ سے باہر چلا گیا تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ دوبارہ اپنی خوشی سے واپس آسکیگا"

جاورہ سے میرا باہر نکلنا

اس لطیف مدبّرانہ اشارہ کو کامدار صاحب نہ سمجھ سکے۔ اور اُنھوں نے کوئی اثر اس کا نہیں لیا۔ آخر مجھے اپنی قسمت آزمائی کے لئے خدا کی وسیع دنیا میں نکلنا پڑا۔ جاورہ سے باہر میرے واسطے پھر کسی جگہ کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ یہ محض اتفاقی امر تھا کہ کانپور کو میں نے اپنی وکالت کی مشق کے لئے منتخب کیا۔ والد صاحب کو جس بات کا اندیشہ تھا وہی چیز پیش آئی۔ یعنی "چڑیا کا بچّہ گھونسلے سے نکل کر پھر واپس نہ آیا"۔

کانپور اور اُس کے بعد الہ آباد میں میرا علحدہ گھر بس جانے کے باعث

والد صاحب کی نگاہ بھی کافی وسیع ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے نہیں کہ جاورہ سے ان کا لگاؤ کچھ کم ہو گیا تھا بلکہ ہم لوگوں کے باہر رہنے کے سبب سے ان کا دل چاہتا تھا کہ سال میں کچھ روز ہم لوگوں کے پاس بھی آکر گذاریں۔ میری شاہ اُن کے قیام کا زمانہ سکون و آرام سے بسر ہوتا تھا مگر ان کا یہ خیال کہ میں کسی پر بار نہ بن جاؤں اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ جب تک میرے یہاں قیام کرتے تھے برابر یہی کوشش رہتی تھی کہ ان کی ذات سے ہم لوگوں کو کسی نہ کسی طرح کا فائدہ ہی پہنچتا رہے۔ وہ اس زمانہ میں تعمیر و مرمت مکان کی نگرانی کرتے، باغات کے نقشے تیار کرتے، درخت نصب کراتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی بیش بہا نصیحتوں سے زندگی کی دشوار گزار راہوں میں ہماری رہنمائی کرتے۔

مرحوم کے سیاسی خیالات

مرحوم کے آخری حصۂ عمر میں ہندوستان اپنے سیاسی خواب گراں سے اچھی طرح بیدار ہو چکا تھا۔ ہوم رول کی تحریک تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ عوامی حکومت کی مانگ شباب پر تھی۔ جلسے جلوس، بلوے زوروں پر تھے۔ اکابرین ملک جمہور کی رہنمائی کر رہے تھے۔ لیکن مرحوم جمہوریت کے اُن نظریوں اور عوامی حکومت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی نہ کر سکے۔ وہ اگلے وقتوں کے آدمی تھے۔ عوام کی سیاسی دانشمندی اور صحت فکر کے زیادہ قائل نہ تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عوام کو اپنی فلاح و بہبود کے وسائل سوچنے کے لئے تنہا

نہ چھوڑنا چاہیے۔ بلکہ یہ فرض اراکین حکومت کا ہے کہ وہ اپنے وسیع ذرائع سے کام لیکر عام رعایا کے لئے آرام و آسائش کے سامان مہیا کریں۔ انکی رائے تھی کہ عوام کے مقابلہ میں مدبرین حکومت اپنے علم و تجربہ کی بناء پر یہ فیصلہ کرنے کے زیادہ اہل ہیں کہ کن شاہراہوں پر چل کر عوام زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اُن کے اس عقیدہ کا سبب یہ تھا کہ ریاست جاورہ میں اُنھوں نے اسی اصول پر عمل کر کے حکومت کے مختلف شعبوں کے ذریعہ عوام کی بہت سی مفید خدمات انجام دی تھیں۔

الہ آباد کا قیام

لیکن اب لوگوں کے سوچنے کے طریقے بدل چکے تھے۔ لہذا جب وہ الہ آباد پہنچے تو پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالوی جیسے جدید سیاسی خیالات رکھنے والے رہنماؤں کی بستی میں اُنھوں نے اپنے آپ کو اجنبی محسوس کیا۔ انگریزی زبان کا نہ جاننا بھی نئے عہد کے رجحانات سمجھنے میں بڑا حارج بنا رہا۔ ان کی خودداری بھی اس راہ میں حائل رہی۔ والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ "خودداری تمھارے والد کی طبیعت ثانی بن گئی ہے"۔ وہ کسی حالت مین بھی اپنی انفرادیت کو فنا کر دینے پر تیار نہ تھے۔

عمل اور مسلسل عمل اُن کے کردار کا نمایاں وصف تھا۔ وہ ہرگز اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ خاموشی اور سکون یا گیان دھیان کی زندگی بسر کریں۔ ہر وقت اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام مین مشغول رکھنا ان کی عادت ہوگئی تھی۔

اور اسی قسم کی جد و جہد کی زندگی انھیں دل سے مرغوب تھی۔

جذبۂ انفرادیت

جب کبھی وہ الٰہ آباد آتے تو ان کا حسنِ اخلاق اور ذاتی کشش انھیں خاص و عام کی توجہ کا مرکز بنائے رکھتی تھی۔ ہر وقت اُن کے گرد لوگوں کا مجمع رہتا تھا اور سب اُن کا ادب و احترام کرتے تھے۔ مگر باوجود اس کے ان کے دل میں ایک خلش سی ہوتی رہتی تھی۔ وہ یہ کہ خواہ کچھ بھی ہو الٰہ آباد میں وہ ڈاکٹر کاٹجو کے والد ہی کی حیثیت سے جانے جائینگے۔ اور اس حیثیت کو قبول کرنے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھے۔ جاورہ میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہاں خود ان کی ذات خاص عزت و تعظیم کا سبب تھی۔ جاورہ میں کوئی بھی چھوٹا بڑا خاندان ایسا نہ تھا جسے وہ کئی پشتوں سے نہ جانتے ہوں۔ اور جس کے کسی نہ کسی فرد کے ساتھ انھوں نے اپنی ذات سے عملی ہمدردی کا ثبوت نہ دیا ہو۔ جاورہ میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو انھیں پنڈت جی کے محبوب لقب سے نہ جانتا اور مخاطب نہ کرتا ہو۔ جبتک مرحوم زندہ رہے عام اس سے کہ میری شخصیت خواہ اپنے پیشے یا قومی خدمات کے اعتبار سے باہر کتنی ہی اہم کیوں نہ تسلیم کی جاتی ہو مجھے جاورہ میں ہمیشہ پنڈت جی کا بڑا بیٹا ہی کہکر جانا اور پکارا جاتا تھا اور میں ان کے نام کے ساتھ منسوب ہونے میں ایک روحانی مسرت محسوس کرتا اور اپنے لئے سب سے بڑا فخر سمجھتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی وفات

۱۹۳۵ء کے بعد کچھ تو نواب افتخار علی خاں مرحوم ا

کے اصرار اور کچھ دوسرے وجوہ سے جس کا اظہار انہوں نے مناسب نہیں سمجھا، وہ جاورہ سے باہر نہیں گئے۔ اِس بارہ میں والدہ صاحبہ کا خیال اُن سے مختلف تھا۔ تیرتھ یاترا کے سلسلے میں والد صاحب کے ہمراہ وہ سارے بھارت کا سفر کر چکی تھیں اور الٰہ آباد سے تو اُنھیں خاص شیفتگی تھی۔ آخری عمر میں جب نگاہ بھی کمزور ہو گئی تھی اُنھیں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا جسے انھوں نے ظاہر بھی کیا۔ یعنی یہ کہ میں اپنے شوہر کی خدمات کی ذمہ داریاں کافی طور سے پوری کر چکی ہوں۔ اب تو میری آرزو یہی ہے کہ زندگی کے باقی دن تربینی کے کنارے بسر ہو جائیں۔ خدا نے ان کی یہ آرزو پوری کی۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ان کا انتقال الٰہ آباد ہی میں ہوا۔ والد صاحب ان کے بعد چھ برس اور زندہ رہے۔

جاورہ والوں سے والد صاحب کے تعلقات

زندگی کے آخری زمانہ میں والد صاحب اپنے اعلیٰ اوصاف اور امتیازی خصوصیات کے باعث جاورہ میں ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔ وہاں ہر مذہب و ملّت کے لوگ کیا اعلیٰ کیا ادنیٰ سب ان کی ذات پر فخر کرتے تھے اور اُنھیں اپنا بزرگ اور سچّا ہمدرد مانتے تھے۔ ہر جگہ ان کی غیر معمولی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ان کی بیشمار مُنھ بولی ہندو مسلمان بیٹیاں تھیں۔ اسی طرح ان کے منھ بولے پوتے پرپوتے، نواسوں اور پرنواسوں کی کوئی گنتی نہ تھی۔ گاؤں کے غریب سے غریب

کاشتکار سے لیکر معزز شہریوں تک رات دن اُن سے ملنے آتے رہتے تھے۔ مرحوم اُنھیں مفید مشورے دیتے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرتے اور اُنکی امداد کرتے تھے۔

مُلازم

میرے چھوٹے بھائی آخر تک والدصاحب کے ساتھ رہے۔ مگر مرحوم کی زیادہ تر خدمت خود اُن ہی کا ایک دیرینہ وفادار ملازم لچھمن سنگھ نامی کرتا تھا۔ یہ اتنا مزاج شناس ہوگیا تھا کہ ہر کام ان کی عین مرضی کے مطابق انجام دیتا تھا۔ ہمارے یہاں اُس کی حیثیت محض ایک ملازم ہی کی سی نہ تھی بلکہ خاندان کے ایک فرد کی طرح عزیز رکھا جاتا تھا۔ اُس کے بچے مرحوم کے پاس کھیلنے آیا کرتے تھے۔

والدصاحب کی بزرگانہ شفقت اور پُرخلوص محبّت کی وجہ سے جاورہ ہمارے کنبہ اور دوسرے عزیزوں کے لئے زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ مرحوم نہایت فراخدلی کیساتھ اپنے تمام مہمانوں کے آرام و آسائش کا انتظام کرتے اور اپنے تجربہ و دانشمندی سے اُنھیں مستفید کیا کرتے تھے۔

مرحوم کی تین خواہشیں

آخری زندگی میں اُن کی تین بڑی خواہشیں تھیں۔ اوّل یہ کہ ضروریات زندگی کیلئے وہ اپنے کفیل خود ہی رہیں۔ اس دنیا میں کسی دوسرے شخص حتیٰ کہ اپنی اولاد تک کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ ان کی غیور طبیعت ہمیشہ اس امر میں کوشاں

رہتی تھی کہ دوسروں سے کچھ نہ لیں بلکہ اپنے پاس سے دوسروں کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسری خواہش یہ تھی کہ آخر دم تک تندرست رہیں۔ اپنی خبر گیری اور تیمارداری کے لئے کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ تیسری اور سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ جاورہ اور اپنے آبائی مکان میں اس دنیا کو خیرباد کہیں۔ ایک مرتبہ مجھے مرحوم نے وہ کمرہ بتایا جس میں کہ وہ پیدا ہوئے تھے اور اس کی طرف اشارہ کر کے بڑے پُرحسرت لہجہ میں فرمایا کہ "میں اس جگہ کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں جہاں میری زندگی نے پہلا سانس لیا تھا"

ان کی تینوں خواہشیں پوری ہوئیں۔ اُنھیں تین سو روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ ہم لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ اب ان پر کنبہ کی پرورش کا بار نہ تھا۔ لہٰذا وہ اپنی پنشن اور پس انداز رقم سے لوگوں کی امداد کرتے تھے۔ اُنھوں نے کئی غریب گھرانوں کے وظیفے جاری کر رکھے تھے۔ امورِ خیر سے اُنھیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا اور ان کی پہلی خواہش مکمل طور سے پوری ہوئی۔

اصولِ صحت کی پابندی

میں نے مرحوم کی طرح اپنی صحت کا خیال رکھنے والا کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا۔ غذا کے لئے ایک خاص مقدار مقرر تھی۔ ورزش بڑی پابندی سے کرتے تھے ہمیشہ مقررہ وقت پر سو جاتے تھے۔ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو اپنا وزن کراتے

اگر ذرا بھی کمی بیشی معلوم ہوتی تو اُسے صحیح معیار پر لانے کی غرض سے ہر طرح کی تدابیر اختیار کرتے تھے۔ جسم کے مختلف اعضاء مثلاً کان، آنکھ، منھ، دانت اور جوڑوں کے لئے خانہ ساز عرق و روغنیات کا ذخیرہ موجود رہتا تھا، جسے وہ پابندی کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اصول صحت پر اس درجہ کاربند ہونے کی بابت اگر میری زبان سے کبھی کچھ نکل جاتا تو فرماتے "ابھی تمھیں صحت کی قدر نہیں تم نہیں سمجھتے کہ صحت انسان کی کتنی بڑی دولت ہے"

اسی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ چوراسی برس کی عمر میں اُن کے پوری دانت موجود تھے۔ بینائی اتنی اچھی تھی کہ ایک پوسٹ کارڈ پر تقریباً تیّس سطریں لکھ سکتے تھے۔ وہ قدامت پسند بزرگ تھے۔ میری والدہ کے انتقال کے بعد اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ کسی دوسرے کا تیار کیا ہوا کھانا بالکل نہیں چھوتے تھے۔ آخر دم تک اِن کے تندرست رہنے کی خواہش بھی پوری ہوئی۔

وفات فروری ۱۹۴۵ء میں وہ بظاہر بالکل تندرست تھے۔ صبح ناشتہ کے بعد کسی مرض کے اچانک حملہ سے بیہوش ہو گئے اس کے بعد پھر ہوش نہیں آیا۔ اور پانچ دن کے بعد دنیا سے کوچ کر گئے۔ اس لحاظ سے جب تک اُن کے ہوش وحواس قائم رہے وہ اپنی جسمانی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہوئے۔ اور اس طرح اُن کی تیسری اور آخری خواہش بھی پوری ہو گئی۔

جس وقت اُن پر مرض کا حملہ ہوا میں لاہور ہائیکورٹ میں ایک مقدمہ میں بحث کر رہا تھا۔ اطلاع ملتے ہی فوراً روانہ ہوا۔ جاورہ پہنچکر میں نے ڈاکٹر سے تشخیص مرض کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ ابھی تشخیص مرض کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کیجا سکتی ہے۔ مگر یہ یقین ہے کہ اگر ہوش آ بھی گیا تب بھی پنڈت جی نشست و برخاست کے قابل نہ ہوسکیں گے۔ میں نے کہا ایسی زندگی تو اُن کے لئے موت سے بدتر ہوگی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ایسی حالت سے پناہ مانگتے رہے ہیں۔

۲۲ فروری ۱۹۴۵ء کو آدھی رات کے وقت اُن کا آخری وقت آ پہنچا۔ دم آخر ہونے سے ذرا پہلے اُنھوں نے اچھی طرح آنکھیں کھولیں اور ہم سب کو جو اُن کے آس پاس جمع تھے اس طرح غور سے دیکھا گویا وہ ہمیں آخری الوداع کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد آنکھیں بند کرلیں۔ اور جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

جاورہ میں مرحوم کا ماتم

جاورہ کے لوگوں نے مرحوم کے سانحہ ارتحال پر اس طرح سوگ منایا گویا ایک میرے ہی والد کا انتقال نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اُن میں سے ہر شخص یتیم ہوگیا تھا۔ ریاست کی تمام فوج اور پولیس، نواب صاحب کے خاندان کے افراد اور ہر فرقہ و مذہب کے لوگوں کا بہت بڑا ہجوم ارتھی کے ساتھ تھا۔ ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ

پنڈت جی کے انتقال سے تاریخ جاورہ کا ایک بڑا دور ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا۔

یوں تو ہر اولاد اپنے والدین کی سرتاپا زیر بار احسان ہوتی ہے، لیکن مجھ پر میرے والد کا خاص احسان یہ تھا کہ اُنھوں نے میری تعلیم پر جو روپیہ صرف کیا تھا اُس کا ایک ایک پیسہ بڑی محنت اور دیانتداری سے کمایا گیا تھا۔ اُس وقت تو میں نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا مگر اب مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہوتا ہے کہ جب میں لاہور اور الہ آباد میں زیر تعلیم تھا تو میری خاطر میرے والدین کو اپنے آرام و آسائش کی کتنی قربانیاں کرنی پڑتی تھیں۔ اُس وقت تک ہمارے خاندان میں اولاد کے لئے خصوصاً تعلیم کی ذیل میں اِس قسم کے ایثار کی کوئی مثال موجود نہ تھی جو اُن کے واسطے دلیل راہ کا کام کرتی۔ یہ میرے والدین کا اپنا ذاتی حوصلہ تھا۔ اُنھوں نے میری تعلیم کی خاطر کسی تکلیف کے برداشت کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں جو تھوڑی بہت کامیابی اور ترقی حاصل کی ہے وہ میرے والد کی کھری کمائی کے پیسے ہی کا نتیجہ ہے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں میں نے "ایل ایل ایم" کا امتحان دیا مگر ناکامیاب رہا اس وقت مجھے فوراً یہ خیال آیا کہ اس ناکامی کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے امتحان کی فیس اپنی کمائی میں سے ادا کی تھی۔ اس لئے جب میں نے دوسرے سال پھر امتحان مذکور میں شرکت کا ارادہ کیا تو والد صاحب سے درخواست کی

کہ وہ مجھے فیس کے لئے سو روپے مرحمت فرمائیں تاکہ یہ بات میری لئے باعثِ فخر رہے کہ میرے والد نے شروع سے آخر تک میری تعلیم کا سارا بوجھ اُٹھایا۔ اُنھوں نے یہ رقم بھیجدی اور میں امتحان میں پاس بھی ہوگیا۔

دو تصویریں

مرحوم ایک برگد کے درخت کی طرح آخر دم تک ہم لوگوں کو اپنے سائے میں لئے رہے۔ میرے پاس اُن کی دو تصویریں ایسی ہیں جن میں وہ اپنی چار پشتوں کے ساتھ (جس میں مرد و عورت سب شامل ہیں) جلوہ افروز ہیں۔ یہ تصویریں ہمارے دلوں میں اپنی بزرگِ خاندان کی اُن برکتوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھیں گی جو اُن کی ذات سے ہم سب کو افراط کے ساتھ نصیب ہوتی رہیں۔ اُنھوں نے ہمارے لئے ایک ایسی زندگی کی شاندار مثال کا گراں قدر ورثہ چھوڑا ہے جو نہایت خلوص کے ساتھ بنی نوع انسان کی خدمت میں بڑی خوبی سے صرف ہوئی تھی۔

والد مرحوم کے مسلمان خاندانوں سے جو گہرے مراسم تھے اور مُلک میں جن شگفتہ ہندو مسلم تعلقات کے دیکھنے کے وہ آرزومند تھے اس کا کچھ اندازہ ایک نجی خط سے ہوسکتا ہے جو مرحوم نے بیگم صاحبہ نواب اصمد یار جنگ بہادر (حیدر آباد) کو لکھا تھا۔ خط کی نقل آئندہ صفحات پر دی جارہی ہے۔ موصوفہ حیدر آباد میں بقید حیات ہیں۔

نقل خط

جناب پنڈت تربھون ناتھ صاحب کاٹجو مرحوم بنام امجدی بیگم صاحبہ

جاورہ - سنٹرل انڈیا -
۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

عزیز از جان من صاحبزادی امجدی بیگم صاحبہ

خدا تعالیٰ تم کو نواب صاحب کو اور لخت جگر بچوں کو سلامت خوش سرسبز اور آباد رکھے۔ دعا کرتا ہوں اور تا زیست کرتا رہوں گا۔ تمہارا سعادت محبت نامہ مورخہ ۱۳ر مئی سنہ رواں مجھ کو بر وقت ملا تھا۔ خلاف ارادہ ارسال جواب میں بہت تاخیر ہو گئی۔ معاف کرنا۔ فی الحال جیسا زمانہ گذر رہا ہے محتاج تشریح نہیں۔ اس وقت غالباً دنیا میں کوئی بھی فکر و پریشانی سے آزاد نہیں مل سکتا ہے۔ یوں تو شکر ہے خدا کے فضل سے خیریت رہی۔ حالات سب بدستور ہیں۔ ہفتہ سوم اپریل سے جو بچوں کا آنا جانا شروع ہوا وہ سلسلہ کچھ ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ ریلوں کی آمد و رفت کی

ﻋﻪ اہلیہ عبد الصمد خاں صاحب سابق ملٹری سکریٹری بھوپال -

بہت کمی ہو گئی - بہ ایں وجہ ریلوے سفر از حد تکلیف دہ ہو رہا ہے - ہر وقت
خیال لگا رہتا ہے کہ نہ جانے ڈاک آنے پر کیا خبر ملے کیا ہو وے - سب کو
بار بار لکھا کہ مت آؤ اپنی جا بیٹھے رہو - دعا کرو کہ خدا اس زمانہ کو کسی طرح
اپنے رحم و کرم سے بسر کرا دے - نہیں مانتے - پریشان رہتا ہوں - میرا مولد
جا در ہے - بچے سب یہیں پیدا ہوئے ہیں - بڑی لڑکی کی عمر کا ساٹھواں
سال عنقریب شروع ہونے والا ہے - وہ ۲۲ سال بعد آئی - کیونکہ منع کرتا
اس کا چھوٹا بھائی بہ عزت و آبرو الٰہ آباد میں رہتا ہے - وہاں آتی جاتی رہتی
ہے - میں بھی ہر سال اُدھر جاتا تھا - سب سے مل لیتا تھا - اِدھر چھ سال سے
نہیں جا سکا - باوجود کوشش ارادہ پورا نہ ہوا - بنظر تکلیف ریلوے سفر کہ
پابندی اوقات نہیں ہو سکتی، ایک موٹر بڑی چار ہزار میں خریدی تھی کہ
بذریعہ موٹر سفر کروں گا - ایسے اتفاقات پیش آئے کہ نہ جا سکا - یہی کہا جا سکتا
ہے کہ ادھر کا آب و دانہ اب قسمت میں نہیں رہا ہے - آفتاب لب بام ہوں
خدا جانے کس وقت زندگی پوری ہو جاوے - سب سے چھوٹی لڑکی بھی
مع اپنے بچہ کے چودہ برس بعد آئی - دونوں کو آتے ہی بتاکید کہا کہ تم نے
مجھ کو دیکھ لیا، میں نے تم کو - واپس جاؤ اور اپنے بال بچوں میں رہو - نہ مانا -
۵ رجولائی کو دونوں واپس گئیں - ۴۸ گھنٹے سخت پریشان رہا - سفر دور دراز
دوسرے روز شام کو ٹیلیگرام خیریت کا آنے پر اطمینان ہوا -

کیلاش ناتھ یعنی ڈاکٹر کا بچو شروع میں آیا تھا۔ ہفتہ عشرہ رہا۔ اُس کے لڑکے شوناتھ نے دو پھیرے کئے۔ اس کی دلہن اور بچّہ تو ۲۲ اپریل سے یہاں ہی ہیں۔ الٰہ آباد میں فوجی ایک سینٹر بنایا گیا ہے، بایں وجہ وہاں کا قیام اب اطمینان کے قابل نہیں ہے۔ اہلیہ کیلاش ناتھ بہ موسم گرما الٰہ آباد میں بوجہ زیادتی گرمی نہیں رہ سکتی۔ وہ ڈھائی ماہ سے زیادہ عرصہ ہوا المورہ پہاڑی مقام پر ہے۔ یہ ہم لوگوں کی مختصر کیفیت ہے۔ چھوٹا لڑکا امرناتھ یہاں ریونیو سکریٹری حضور سرکار عالی ہے۔ اس کے دو لڑکے ہیں بڑا گیان ناتھ۔ اس کو تحصیل علم میں دلچسپی کم دیکھ کر، شری شیواجی ملیٹری کالج پونا میں آٹھ سال ہوئے داخل کر دیا تھا۔ وہاں کے پرنسپل کرنل گوٹ بہت ہی لائق اور قابل تھے۔ چار سال ان کے زیر تربیت رہ کر اور وہاں کی تعلیم پوری کر کے دہلی میں شریک امتحان ہوا تھا۔ وہ امتحان بہت ہی سخت ہے، پاس نہ ہوا۔ اگر کامیاب ہو جاتا تو دہرہ دون میں مزید تعلیم پاتا۔ عزیز و اقارب اکثر ریاستوں میں ہیں۔ تیسرا سال ہے ریاست گوالیار کی فوج میں داخل ہو کر اوّل وہاں تعلیم پائی۔ ریاست کی طرف سے دہرہ دون بھیجا گیا۔ اگرچہ وہاں کا کورس دو سال کا تھا، بوجہ لڑائی وہ ایک ہی سال میں پورا کرا دیا گیا۔ اس میں پاس ہو جانے سے لفٹننٹ کا درجہ ملا۔ مزید کام سیکھنے ریاست نے ساگر بھیجا تھا۔ ایک ماہ وہاں کام سیکھ کر گئے مہینے واپس

گوالیار آیا ہے ۔ دہرہ دون اور ساگر میں جیسی اور جو محنت کرنا پڑی
بس خدا تعالیٰ ہی رحم فرماتا ہے۔ لکھا تھا کہ اندھیری رات میں بلا روشنی
اور سڑک کے موٹر چلانا سکھایا گیا کہ نہیں معلوم ہوتا کہ دس فٹ پر آگے کیا ہے۔
کچھ نہیں معلوم کہ اسے کیا کام دیں، کہاں جانا پڑے۔ دعا کرتے رہتے ہیں
کہ خدا اس کا محافظ اور نگہبان رہے۔ اس کا چھوٹا بھائی چند سال سے الہ آباد
میں تعلیم پا رہا ہے۔ اب اس کی تعلیم بی۔ اے شروع ہو گی۔ کیلاش کا
دوسرا لڑکا رام ناتھ تین سال ولایت میں رہا۔ بی۔ اے وہاں پاس کر کے
بیرسٹری کی تعلیم شروع کی تھی۔ لڑائی شروع ہو جانے سے بہ مشکل تمام ہندوستان
واپس آیا۔ دو ہفتہ کا سفر دو ماہ میں پورا کیا۔ دو سال گذشتہ میں دو امتحان
یہاں دیئے۔ اب آخری امتحان تھوڑے ہی دن ہوئے دہلی میں دے کر
آیا ہے۔ خدا رحم فرمائے۔ کامیابی نصیب ہو۔ چونکہ ازراہِ سعادت ولیاقت
صرف گیانی کا حال بڑی محبت کے ساتھ عزیزوں کی طرح تم نے دریافت
کیا تھا۔ میں نے سب ہی حال تحریر کر دیا کہ تم کو مسرت ہو گی۔ تم بہت لائق
اور ہوشمند ہو۔ تم نے مجھ سے پرانے حالات دریافت کئے ہیں۔ تمھارا مولد
جاورہ ہے۔ تمھارے بزرگ اس ریاست کے معزز رکن سردار اور سرکاری
خاندان سے وابستہ تھے۔

میں مختصراً تحریر کرتا ہوں کہ یہ ریاست بموجب عہد نامہ سنہ ۱۸۱۸

حضور نواب عبدالغفور خاں دلیر جنگ نے قائم فرمائی ہے۔ کتاب عہد نامہ جات میں افسران مقتدر گورنمنٹ نے تحریر فرمایا ہے کہ سنٹرل انڈیا میں چھ رولنگ چیف ہیں۔ گوالیار۔ اندور۔ بھوپال۔ دھار۔ دیواس و جاورہ دو اہل اسلام اور چار مرہٹہ۔ جو درجہ و مرتبہ گوالیار کا ہے جس کی آمدنی قریب تین کروڑ ہے، وہی جاورہ کا ہے۔ سنہ ۱۸۱۸ء میں ریاست قائم ہونے پر کُل کام حضور موصوف کے داماد محمد جہانگیر خاں صاحب بطور دیوان یا مدارالمہام انجام دیتے تھے۔ دوسرے لائق عہدہ دار کی جو مال اور مداخل مخارج کا کام انجام دے، ضرورت پیش آئی تو حضور ممدوح نے اپنے معزز خسر آخون محمد ایاز خاں صاحب کو بمقام جیپور تحریر فرمایا۔ یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ آخون صاحب موصوف ایک نہایت اعلیٰ سردار کابلی افغان تھے اور ادھر تشریف لے آئے تھے۔ ان کی تین صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی صاحبزادی کی شادی اعلیٰ حضرت بہادر شاہ صاحب شاہ دہلی سے ہوئی تھی۔ دوسری کی حضور نواب امیر خاں صاحب والئ ٹونک سے اور تیسری صاحبزادی کی حضور نواب غفور خاں صاحب بہادر سے۔

آخون صاحب موصوف نے اپنی اقامت جیپور میں رکھی تھی۔ میرے دادا پنڈت منسارام صاحب جیپور میں بعہدہ اعلیٰ مامور تھے۔ جناب آخون صاحب نے میرے دادا کو سنہ ۱۸۲۰ میں یہاں بھیجا۔ وہ آئے۔ ان کو بعہدۂ دیوان

مقرر فرمایا۔ صیغۂ مال اور مداخل ومخارج کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی طرح
میرا حقیر خاندان ۱۲۳ سال سے اپنے آقا اور مالک کا خدمتگذار رہے۔
میرے والد کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ میری پیدائش ۲۹ ستمبر ۱۸۶۱ء
کو بزمانہ حضور نواب غوث محمد خاں صاحب بمقام جاورہ ہوئی ہے۔ میرا
مولد و وطن جاورہ ہے۔ میری دلی خواہش و آرزو ہے کہ یہ جسم خاکی جاورہ
کی آب و گل سے وجود میں آیا ہے زیر قدوم آقائے نامدار میری خاک
یہاں کی ہی خاک میں مل جاوے۔ موجودہ رفتار اور حالتِ زمانہ سے
قطع نظر کرتے ہوئے کچھ عرصہ پہلے تک یہاں ہم تفریق ہندو مسلمان جانتے
ہی نہ تھے۔ تم یقین ماننا میں ہندو مذہب کی فلاسفی سے بہت کم واقف
رہا۔ کلام شریف کا ترجمہ اُردو۔ الحقوق والفرائض مجموعۂ احادیث نبوی
مترجمہ مولانا نذیر احمد صاحب بہت شوق اور توجہ سے پڑھے ہیں۔ اب
حالت یہ ہے کہ انسان انسان کو کھائے جاتا ہے۔ خدا جلّ شانہٗ رب العالمین
ہے۔ کوئی خیال نہیں کرتا۔

تمھارے پر دادا کا نام غلام محمد خاں صاحب تھا۔ میں نے ان کو
نہیں دیکھا۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے کپتان نیاز محمد خاں صاحب
تمھارے دادا۔ دوسرے اجیٹن نذر محمد خاں صاحب۔ جہانگیر خاں صاحب
موصوفۂ بالا کی دو ہمشیرہ تھیں۔ ایک کی شادی غلام محمد خاں صاحب سے

ہوئی تھی اور دوسری کے لڑکے محمد عثمان خاں صاحب تھے۔ ان کے والد کا نام یاد نہیں۔ جہانگیر خاں صاحب اعلیٰ حضرت نواب محمد عبدالغفور خاں صاحب بہادر کے بھانجے تھے۔ قائمی ریاست جاورہ کے بعد محمد جہانگیر خاں صاحب نے اپنے بھانجوں کو رامپور سے بلاکر نیاز محمد خاں صاحب تمھارے دادا کو بعہدۂ کپتان اور ان کے بھائی نذر محمد خاں صاحب، نصرت محمد خاں کے دادا کو اجیٹن کے عہدہ پر مقرر فرمایا تھا۔ یہ تنخواہیں موروثی اور رشتہ داری کی سمجھی گئیں اور تقسیم ہو کر تمھارے والد و چچاؤں کو ابتک مل رہی ہیں۔ تمھارے والد اور چچاؤں کی نانی محمد عثمان خاں صاحب کی لڑکی تھیں۔ انھوں نے تمھارے چچا جہانگیر محمد خاں کو اپنا بیٹا بنایا تھا۔ ان کی تنخواہ اور ان کی جاگیری آراضی جہانگیر محمد خاں کو ملی ہے۔ اور وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

میرے والد ماجد کا انتقال ۲۹ جنوری ۱۸۷۶ء کو ہوا ہے۔ وہ بعہدۂ وکیل دربار جاورہ معزز اور خدمت میں پولیٹکل ایجنٹ صاحب کے بمقام چھاؤنی آگر حاضر رہ کر کل کام پولیٹکل انجام دیا کرتے اور انکی وساطت ہوا کرتا تھا وہ کام جواب ریاستوں کے مدارالمہام بذریعہ تحریرات وزبانی انجام دیتے ہیں۔ انگریزی خط وکتابت اس وقت بالکل نہیں ہوتی تھی، نہ انگریزی خواں ریاستوں میں تھے۔ وقت رحلتِ والد میری عمر ۱۴ سال چار ماہ تھی۔ میرے آقا و مالک نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب بہادر فیروز جنگ نے

مجھ طفل مکتب کو بجائے والد مرحوم مقرر فرمادیا۔ خدا ہی کی کچھ شان ہے کہ وہ کام اور بڑے بڑے معاملات ایک کودک نادان سے قدرت ایزدی نے انجام دلوائے۔ میرا اس لکھنے سے یہ مطلب ہے کہ جب سے ۱۸۹۴ء تک میرا ساتھ تمھارے دادا کپتان صاحب سے رہا ہے وہ سرداران اور اراکین ریاست میں سے ایک بڑے دبدبہ اور شان کے تھے۔ بہ سواری اسپ انھیں ایک صاحب کو محل سرکاری پر روزانہ آتے ہوئے دیکھا ہے۔

ہمارے آقا نے مارچ ۱۸۹۵ء میں رحلت فرمائی۔ اس سے ایک سال قبل کپتان صاحب موصوف کا انتقال ہوا تھا۔ حضور نواب عبدالغفور خاں صاحب کی دوسری شادی ایک مغل سردار مرزا کریم یار خاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے حضور نواب غوث محمد خاں صاحب شوکت جنگ پیدا ہوئے تھے۔ جنھوں نے ۱۸۸۵ء تک اس دربار کی فرمانروائی کی۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ حضور موصوف کا سب اعتبار کپتان صاحب موصوف پر تھا، اور ان کے مصاحب اعلیٰ کپتان صاحب تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں حضور موصوف نے کپتان صاحب کو مقابلہ باغیان کے لئے بھیجا تھا۔ بیگم صاحبہ ثانی کی دو ہمشیرہ اور ایک بھائی تھے۔ منجھلی خانم صاحبہ۔ چھوٹی خانم صاحبہ اور مرزا اللہ یار خاں صاحب۔ یہ صاحب عرصہ تک مثل محمد جہانگیر خاں صاحب مدار المہام رہے۔ اس وقت جو مغل اراکین ہیں

جن کو موروثی تنخواہیں مل رہی ہیں۔ یہ سب انھیں تین کی اولاد ہیں۔ اگر مفصّل تحریر کروں ایک دفتر چاہئے۔ مختصرًا میں نے تحریر کیا ہے۔ امید کہ تم سب مع الخیر ہوگے۔

مجھے کمال مسرّت اور خوشی ہے کہ خدا تعالیٰ کی عنایت سے اولاد جناب کپتان نیاز محمد خاں صاحب مرحوم میں تم نے اس خاندان گرامی کا نام روشن کیا اور ایسا مرتبہ ایک عالیشان ریاست حیدر آباد میں پایا جو باعث رشک ہر کہ و مہ ہو سکتا ہے۔ خدا تم کو اور نواب صاحب کو خوش اور سلامت رکھے۔

مجھے سخت افسوس ہے کہ تم جب یہاں آئیں، تم نے تو از راہ سعادت و لیاقت یاد کیا۔ مگر مجھے تمھارے دیدار حاصل نہیں ہوئے۔ اور میں حاصل نہ کر سکا۔ چار روز اوّل یا بعد۔ اس وقت یاد نہیں میں بیمار ہو کر صاحب فراش ہو گیا۔ شکر ہے اب اچھا ہوں۔ ایام زندگی باقی پورے کر رہا ہوں۔ میری عمر اس وقت ۸۱ سال ہے۔ کیا لکھوں کہ میں نے اس عمر دراز میں کیا کیا واقعات اور تغیّر و تبدّل زمانہ دیکھا ہے۔ براہ مہربانی نواب صاحب کو میرا سلام نیاز دعاء خیر کے ساتھ کہنا۔ بچّوں کو دعاء درازی عمر کیساتھ پیار۔ افسر جہاں بیگم اگر کہیں ملیں میری دعا کہنا۔ وہ تو مجھ کو بھول گئیں، مگر میں تو ان کو فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ سردار محمد خاں صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ ان کے والد خان بہادر یار محمد خاں صاحب سی۔ ایس آئی

کے بھانجے تھے۔ مجھ سے عمر میں دو سال بڑے۔ بچپن۔ جوانی۔ بڑھاپا
ساتھ ساتھ گذرا۔

میرا خط بہت طولانی ہو گیا۔ دو روز میں پورا کیا۔ آنکھیں کمزور
ہو گئی ہیں۔ بہرحال تمھارے لکھنے کی تعمیل کرنا بھی ایک فرض تھا۔

تمھارا خیر طلب

خاکسار تربھون ناتھ کا بجُّو

والدہ مرحومہ

سببِ تالیف

ہر اولاد کو اپنی ماں کی ہستی بہت عزیز ہوتی ہے اور اس دنیا میں اُسے ماں سے زیادہ محبوب شئے کوئی نظر نہیں آتی۔ مگر میری ماں کو قدرت نے ایسی خوبیوں کا مجموعہ بنایا تھا کہ وہ صرف مجھ ہی کو نہیں بلکہ جس کو بھی ایک مرتبہ اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ اُسی سیکڑوں ہزاروں عورتوں میں یکتا معلوم ہوئیں۔ اب مجھے خیال ہوتا ہے کہ مرحومہ اپنے زمانہ سے پچاس برس پہلے پیدا ہوئی تھیں، اگر وہ پچاس برس بعد پیدا ہوتیں تو جو اعلیٰ خیالات اُن کے تھے اور جو دماغی صلاحیتیں قدرت نے اُنھیں عطا کی تھیں، اُن کا اندازہ کر کے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے وطن کے طبقۂ نسواں کی بڑی مفید خدمات انجام دیتیں اور بڑے نام و نمود کی مالک ہوتیں۔ اس خیال سے کہ ناظرین کو ایک ایسی تعلیم یافتہ اور روشن دماغ خاتون کے حالاتِ زندگی پڑھ کر روحانی مسرت ہوگی۔ مرحومہ کا کچھ حال میں یہاں لکھتا ہوں۔ اس احساس سے مجھے بھی ایک گونہ تسکین ہوگی کہ میں نے اپنی زندگی میں اپنی مقدس والدہ کا اہلِ ملک سے تعارف کرایا۔

ولادت

مرحومہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ ان کے والد پنڈت نندلال کشمیری پنڈت تھے۔ وہ ابتداءً ضلع حصار

اور اس کے بعد بہت عرصہ تک ہوشیار پور میں سرکاری ملازم رہے۔ میری والدہ کی پیدائش ماگھ سمت ۱۹۱۵ مطابق جنوری ۱۸۵۹ء میں بمقام سرسا ضلع حصار ہوئی۔ والدین نے رام پیاری نام رکھا۔ سسرال سے سہاگ رانی خطاب ملا۔ دراصل نام اور خطاب دونوں بڑی نیک ساعت میں تجویز کئے گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ رام کی پیاری تھیں اور شادی کے پورے اکہتر برس بعد اپنا سہاگ اپنے ساتھ لیکر اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔

تعلیم و تربیت

پنڈت نند لال اپنی اس لخت جگر سے غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ گھر میں خدا کے فضل سے ماں اور دادی موجود تھیں بڑے ناز و نعمت میں پرورش ہوئی مگر جہاں تک تعلیم کا سوال ہے اس طرف توجہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لیکن وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ تعلیم نسواں کا رواج بالکل نہ تھا۔ والدہ صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ ان کی دادی کے ذہن میں یہ بات پورے طور سے جمی ہوئی تھی کہ رُوس کے رہنے والے سب "گھوڑمونہے" ہوتے ہیں۔ ریل اُس زمانہ میں نئی نئی جاری ہوئی تھی۔ مگر دادی اماں کو مرتے دم تک یقین نہیں آیا کہ انجن بھاپ کے زور سے چل سکتا ہے۔ ریل پر تو وہ کبھی بیٹھی ہی نہ تھیں۔

گھر کی چار دیواری کے اندر عورتوں کی یہ حالت تھی مگر پنڈت نند لال صاحب تعلیم کے بڑے دلدادہ تھے۔ اُنھوں نے بیوی کی روک تھام کے باوجود اپنی

نورنظر کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ ہندی اور فارسی کی تعلیم دی۔ قدرت نے بیٹی کو دماغ بہت اچھا دیا تھا۔ سنسکرت اور ریاضی جیسے محنت طلب مضمون اپنے ذاتی شوق سے حاصل کئے۔ جغرافیہ اور نجوم میں کافی دستگاہ بہم پہنچائی۔ جوتش میں ایسا کمال تھا کہ بڑے بڑے پنڈتوں اور جوتشیوں سے مباحثے کرتی تھیں۔ فارسی میں گلستاں، بوستاں اور دیوان حافظ آخر وقت تک یاد تھے۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ ایک بار جو چیز سن لیتیں یا پڑھ لیتیں وہ ہمیشہ اُن کے دماغ میں محفوظ رہتی تھی دھرم شاستر سب پڑھے تھے اور گیتا تو نوک زبان تھی۔

شادی

اُن کی شادی نو برس کی عمر میں میرے والد پنڈت تربھون ناتھ کاٹجو کے ساتھ سمت ۱۹۲۵ مطابق ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ ہمارا وطن مالوے کے ایک دور افتادہ مقام جاورہ میں ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ۱۸۸۵ء تک یہاں ریل نہ تھی۔ پُرانے خیالات، پُرانے دستور، میری والدہ بھی قدیم رواج کے مطابق پچاس برس کی عمر تک یہاں پردہ میں بند رہیں۔

تعلیمی شوق

شادی کمسنی میں ہو گئی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد گھر گرہستی کا سارا بوجھ اُن کے سر پڑ گیا۔ گھر کا کل کام پکانا ریندھنا، سینا پرونا، بچّوں کی دیکھ بھال سب کچھ خود کرتی تھیں۔ اسی کے ساتھ تعلیم کا شوق بھی تھا۔ خود بھی پڑھتی تھیں۔ دوسروں کو بھی پڑھاتی تھیں۔ دوپہر ڈھلے، ایک دو بجے کے قریب گھر کے دھندوں سے فرصت ملتی تو محلّے کی

لڑکیاں آجاتیں اور ایک چھوٹا سا اسکول قائم ہوجاتا۔ والدہ صاحبہ ان کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔

ذہانت کشمیری پنڈتوں میں پردہ باہر والوں سے کیا جاتا ہے۔ قریبی عزیزوں مثلاً سسر، جیٹھ وغیرہ سے نہیں ہوتا۔ ہمارا کنبہ کافی بڑا تھا۔ خاندان کی عورتیں اور مرد والدہ صاحبہ کو گھیرے رہتے تھے۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے اُن سے بکثرت عنوانات پر گفتگو کرتے تھے۔ کبھی اخبار پڑھا جاتا تھا، کبھی دنیا کے تجربے بیان ہوتے تھے، سیاسی اُمور پر اظہار خیال ہوتا تھا معاملات ریاست پر رائے زنی کی جاتی تھی۔ وہ یہ سب سنتی اور سمجھتی تھیں۔

فرماتی تھیں کہ ایک مرتبہ شادی سے چند سال بعد تمھارے تایا شام کو گھر آئے اور کہنے لگے کہ آج ایک شخص نے نواب صاحب کے سامنے ایک عجیب سوال بیان کیا جو کسی اخبار میں شائع ہوا ہے۔ ہم لوگوں نے اُسے حل کرنے کی بہت کوشش کی مگر صحیح حل کوئی نہ معلوم کرسکا۔ میں نے پوچھا کہ وہ سوال کیا تھا؟ اُنھوں نے کہا سوال یہ تھا کہ ایک آدمی کے نو لڑکے ہیں اور اکاسی ۸۱ موتی اُس کے پاس ہیں۔ موتیوں کی قیمت کا تناسب یہ ہے کہ اگر ایک موتی کی قیمت ایک روپیہ ہے تو دوسرے کی دو روپے، تیسرے کی تین روپے۔ اسی طرح ہر موتی پر ایک ایک روپیہ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخری موتی کی قیمت اکاسی ۸۱ روپے ہے باپ کی خواہش ہے کہ ہر لڑکے کو نَو، نَو موتی ملیں، لیکن تقسیم اس طرح پر ہو کہ ہر لڑکے کی

کا حصہ قیمت میں بھی برابر آئے۔

میں سنکر خاموش ہو گئی۔ سوال مشکل معلوم ہوا۔ جب سب سو گئے تو کاغذ پنسل لیکر بیٹھ گئی اور کوئی دو گھنٹے میں سوال حل کر لیا۔ دوسرے دن جواب لکھکر تمھارے تایا جی کو دیدیا۔ اُنھیں بڑا تعجب ہوا۔ وہ اُسی لئے ہوے دربار گئے۔ اور بڑے فخریہ لہجے میں نواب صاحب سے کہا" ملاحظہ فرمائیے! میری بھاوج نے سوال حل کر دیا۔" سب لوگ دنگ رہ گئے۔ مرحومہ نے وہ حل مجھے بھی بتایا تھا، جو ابتک یاد ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے میں اُسے یہاں لکھے دیتا ہوں۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۰
۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۱۹	۲۰
۳۱	۳۲	۳۳	۳۴	۳۵	۳۶	۲۸	۲۹	۳۰
۴۱	۴۲	۴۳	۴۴	۴۵	۳۷	۳۸	۳۹	۴۰
۵۱	۵۲	۵۳	۵۴	۴۶	۴۷	۴۸	۴۹	۵۰
۶۱	۶۲	۶۳	۵۵	۵۶	۵۷	۵۸	۵۹	۶۰
۷۱	۷۲	۶۴	۶۵	۶۶	۶۷	۶۸	۶۹	۷۰
۸۱	۷۳	۷۴	۷۵	۷۶	۷۷	۷۸	۷۹	۸۰
۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹

واقعی ایک بیس بائیس سالہ خاتون کے لئے جس نے گھر کے اندر رہ کر خود ہی لکھنا پڑھنا سیکھا ہو ایسے سوال کا حل کر لینا کم تعجب خیز بات نہ تھی۔

حقوق نسواں کی حمایت

والدہ صاحبہ گھر میں عام عورتوں کی طرح سبھی کام کاج کرتی تھیں۔ لیکن اُنکے خیالات اُس وقت اور اُس ماحول کے اعتبار سے جس میں کہ اُن کی زندگی بسر ہو رہی تھی عام عورتوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ بلند تھے۔ اُنھیں کامل یقین تھا کہ مردوں نے ناجائز دباؤ ڈالکر عورتوں پر اپنا اثر قائم کر رکھا ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ "مرد، عورتوں کو جانوروں کی طرح اپنی جائداد تصور کرتے ہیں" جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے اگر وہ پچاس برس بعد پیدا ہوتیں تو آج طبقۂ نسواں میں اصلاح و ترقی کی جو تحریکیں چل رہی ہیں ان میں نمایاں حصہ لیتیں۔ وہ اکثر کہتی تھیں کہ "مردوں نے ہم عورتوں کو چولھے کے سپرد کر کے روٹی کپڑے پر اپنا غلام بنالیا ہے۔" جب میں بڑا ہو کر ان باتوں کو سمجھنے لگا تو اُن سے ہنستا اور کہتا کہ امّاں جی آپ باورچیخانہ میں چولھے کے پاس بیٹھکر رزق کی دیوی "انپورنا" معلوم ہوتی ہیں۔ اس پر وہ بہت بگڑتیں اور فرماتیں کہ "تم لوگوں نے ایسی ہی میٹھی میٹھی باتیں بنا کر ہمیں دنیا سے بیکار کر رکھا ہے۔"

ان کی دلی تمنّا تھی کہ ہر عورت اتنا لکھ پڑھ لے اور کوئی مفید ہنر اس قدر سیکھ لے کہ اپنی کفیل آپ ہو سکے اور اپنی روزی کے لئے اُسے مرد کے رحم و کرم پر

نہ رہنا پڑے ۔ وہ مرد و عورت میں مساوات کی قائل تھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ "مرد اور عورت مساویانہ حقوق کی بُنیاد پر گھر چلائیں"

تعلیم نسواں

اس نظریہ کے ماتحت وہ تعلیم نسواں کی زبردست حامی تھیں جب کبھی وہ اخبار پڑھتیں یا سنتیں تھیں کہ ملک کی کسی خاتون نے بی اے یا ایم اے کا امتحان پاس کر لیا ہے، تو باغ باغ ہو جاتیں یہاں اتنا یاد رکھنا چاہیئے کہ میں یہ باتیں آج کی نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ آج سے پچاس برس اُدھر کی بات ہے جبکہ گاؤں اور قصبوں کا تو ذکر کیا بڑے بڑے شہروں تک میں تعلیم نسواں کا چرچا نہ تھا۔

پیدائشِ اولاد کی بابت خیالات

پیدائش اولاد کے بارے میں اُن کے وہی خیالات تھے جنھیں آج قبولیت عام کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ وہ انضباطِ نفس اور ضبطِ تولید کی بڑی حامی تھیں۔ کہتی تھیں کہ بچّوں کی پیدائش کے درمیان کم از کم چار سال کا وقفہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس مدّت میں بچّہ ماں کا دودھ پیکر بڑا ہو جائے۔ اور ماں اچھّی طرح اُس کی دیکھ بھال اور پرورش کر سکے، تب دوسری ولادت ہو۔ کسی عورت کے یہاں جلد جلد ہر دوسرے سال ولادت کا حال سنکر انھیں نفرت سی ہو جاتی تھی اور وہ اس کا ذکر بڑے افسوس کے ساتھ اپنے کنبے اور محلّہ کی عورتوں سے کرتی تھیں۔

کمسنی کی شادی کی مخالفت

شادی کے متعلق اُن کے خیالات نہایت آزاد تھے۔ کمسنی کی شادی کو سخت ناپسند کرتی تھیں اور اس شرط کو کہ برادری کے اندر ہی شادی ہو ضروری نہیں سمجھتی تھیں

مذہبی عقائد

ان کی زندگی ایک سچّی مذہبی زندگی تھی۔ شیوجی کی بڑی عقیدتمند تھیں۔ روزانہ پابندی کے ساتھ باقاعدہ عبادت کرتی تھیں۔ اسی حسن عقیدت کی بنا پر انھوں نے میرا اور میرے بھائی کا نام کیلاش ناتھ اور امرناتھ رکھا تھا۔ مذہبی کتب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔

چھوت چھات

کھانے پینے میں چھوت چھات کا خیال تو کرنا ہی پڑتا تھا، تاہم وہ اس معاملہ میں کٹّر نہ تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ مذہبی کتابوں میں کھانے پینے کی جو پابندیاں درج ہیں وہ نفسِ مذہب اور عبادت سے کوئی سروکار نہیں رکھتیں۔ یہ پابندیاں خود ہمارے جسم کی حفاظت کے لئے ہیں۔ چھوت سے جو بہت سی بیماریاں ہو جاتی ہیں اُن سے بچنے کے لئے بزرگوں نے یہ قاعدے بنائے ہیں۔ انھیں مذہبی رنگ اس لئے دیدیا ہے کہ عوام میں اہمیت بڑھ جائے اور وہ دینی فرائض کے ذیل میں ان پر بھی کاربند ہو جائیں ورنہ یہ سب طبّی اصول ہیں۔

پریاگ میں قیام

میں نے پہلے سمت ۱۹۶۵ مطابق ۱۹۱۱ء میں کانپور میں وکالت کی مشق شروع کی تھی۔ چھ سال وہاں رہ کر

الہ آباد ہائیکورٹ میں وکالت کرنے لگا۔ اس سے قبل ہم لوگوں کا اتر پردیش سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اب تو پریاگ میں اپنا گھر بنا لیا ہے۔ میری وکالت والدہ صاحبہ کے لئے آزادی کا سبب بن گئی۔ وہ سمت ۱۹۶۶ مطابق سنہ ۱۹۰۹ء سے میرے پاس کانپور اور پریاگ میں آنے جانے لگیں۔ کہاں جاورہ کی ریاست۔ قدیم رسوم کی پابندی، پردے کا زور گھر سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا تھا۔ مندروں تک میں عورتوں کے جانے کا رواج نہ تھا۔ کہاں کانپور۔ پریاگ کی دوسری ہی دنیا۔ گنگا جی کا کنارا۔ اور آنے جانے کی کوئی ممانعت نہیں۔

کانپور میں آکر گھر کے سارے کام دھندوں میں ان کی مصروفیت جاورہ ہی کی طرح رہی۔ اس پر مزید یہ ہوا کہ نئی جگہ، میری نئی وکالت۔ غرضکہ بہت سی دشواریاں تھیں، مگر وہ خوش تھیں۔ بیٹے کی گھر گرہستی جمانے ہی کی خوشی کیا کم تھی پھر پردے کی کوئی زیادہ روک ٹوک نہ تھی۔ روز گنگا جی جاتیں، اشنان کرتیں کیلاش مندر میں درشن کرتیں اور گھر واپس آجاتی تھیں۔ یہاں برادری اور غیر برادری کے بہت سے گھرانوں سے ہمارا میل جول ہو گیا تھا۔ ان سب سے ملنے میں انھیں بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ان کی ملاقاتوں میں ہر معاملہ پر بات چیت ہوتی اور وہ اپنے علم و معلومات میں برابر اضافہ کرتی رہتی تھیں۔

پریاگ میں سات آٹھ سال تک میں کرایہ کے مکان میں رہا۔ اس کے بعد سمت ۱۹۷۹ میں اپنے لئے ایک بنگلہ خرید لیا۔ اب تو مرحومہ کو پورا موقع ملا کہ

اپنی منشاء کے مطابق اطمینان کے ساتھ کام کریں۔ پریاگ میں وہ میرے پاس آکر سال سال دو دو سال رہتی تھیں، تربینی، گنگا جی، جمنا جی کے برابر اشنان ہوتے۔ شیو جی اور پنچ مکھی مہادیو کے مندروں میں جاکر درشن کرنے کا اُنھیں بڑا شوق تھا۔ ہمیشہ جایا کرتی تھیں۔ جھونسی اور دارا گنج کے سنت سادھوؤں کی خدمت کرنا بھی اُن کا خاص کام تھا۔

مذہبی معلومات

گھر میں ہمیشہ پوجا پاٹ اور کتھا وغیرہ ہوتے رہتے تھے۔ پنڈتوں، پجاریوں سے اکثر وہ بات چیت اور مباحثہ کرتی تھیں۔ کسی پنڈت کی مجال نہ تھی کہ ان کے روبرو پوجا کرنے میں اصول کے خلاف کوئی عمل کر سکے یا کسی منتر کا تلفظ غلط کر دے۔ ان کو سارے منتر زبانی یاد تھے اور ان کے معنی و مطلب بھی بخوبی سمجھتی تھیں۔ پوجا کے وقت دیکھتی رہتی تھیں کہ تمام باتیں صحیح طور سے انجام دی گئی ہیں یا نہیں۔

خیرات

خیر خیرات کرنے کی عادی تھیں اور چھپا کر خیرات کرتی تھیں کسی کو کانوں کان نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ کس کس کی کیا مدد کر رہی ہیں۔ چلنے پھرنے اور ہوا خوری کا خاص شوق تھا۔ اس وقت کتنے ہی غریبوں، محتاجوں کی امداد کر دیتی تھیں۔

باغبانی سے دلچسپی

میں نے پریاگ میں ایک باغیچہ لگایا تھا۔ باہر کھلی ہوا میں رہنا تو اُنھیں دل سے مرغوب تھا۔

پریاگ میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ باغبانی میں ان کو کتنا کچھ دخل ہے۔ مالیوں کو اپنے سامنے بلا کر ہدایتیں دیتیں اور پھولوں اور پھلوں کے پودے نصب کرائیں۔ مرحومہ کے ہاتھ کے لگائے ہوئے بہت سے آم اور امرود کے درخت اور گلاب، چنبیلی کے پیڑ بطور یادگار کے میرے بنگلے اور باغ میں موجود ہیں

گائے کی سیوا

گائے کی سیوا دل وجان سے کرتی تھیں۔ گائے کے بچّہ ہونا ہمارے گھر میں ایسا ہی ہوتا جیسے کہ بہو بیٹی کی زچگی ہوتی ہے۔ ہفتوں پہلے سے گائے گھر میں آجاتی، والدہ صاحبہ خود اُس کی دیکھ بھال کرتیں۔ بچہ ہونے کے بعد گائے کی خدمت اور کھلائی پلائی بڑے غور کے ساتھ کی جاتی تھی۔ کہیں بچھیا ہوگئی تو والدہ صاحبہ نہال ہوگئیں۔ بچھیا گھر ہی میں پرورش ہوکر پوری گائے ہوجاتی تھی۔ ایسی گائیں نسل در نسل ہمارے یہاں ابھی تک موجود ہیں۔ جبتک بچّہ بڑا نہ ہوجاتا والدہ صاحبہ کا حکم تھا کہ صرف ایک تھن لگا کر باقی تین تھن بچے کے لئے چھوڑ دیئے جائیں۔

جانوروں کے علاج میں بھی اُنھیں کافی دخل تھا۔ کُتّے اور بلّی سے نفرت تھی۔ کہتی تھیں کہ کتّا نجس اور بلّی دغاباز جانور ہے۔ رنگ برنگ کی چڑیاں مثلاً طوطے، مینا بہت پسند تھے۔ انھیں بڑے شوق سے پالتیں اور ان کی نگہداشت کرتی تھیں۔

طبّی معلومات

ڈاکٹری کی طرف خاص رُجحان تھا۔ اگر وہ آجکل کے زمانہ میں ہوتیں تو یقیناً لیڈی ڈاکٹر بنجاتیں۔ بغیر کسی امتحان کے پاس کئے ہوئے اس فن میں اچھا خاصا علم و تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ جسمِ انسانی اور اُس کی ساخت، اعضاء اور ان کے افعال مثلاً دل، دماغ آنکھ، ناک، کان وغیرہ کی ترکیب اور ہر ایک کا فعل اچھی طرح جانتی تھیں۔ ہمارے خاندان میں کئی ڈاکٹر ہیں جو جاورہ اور اندور میں سکونت پذیر ہیں۔ خاص کر ڈاکٹر سدھرسن ہری رام جو عام طور سے ڈاکٹر پنڈت کے لقب سے مشہور اور بڑے نامی سرجن تھے اور مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے تھے انکے دل میں والدہ صاحبہ کی طبّی معلومات کی بڑی قدر تھی۔ والدہ صاحبہ کے واقف فن ہونے کے باعث وہ اُن کے ہر سوال کا جواب نہایت ادب کے ساتھ دیتے تھے اور امراض و علاج کی بابت پیچیدہ سے پیچیدہ باتیں انھیں سمجھاتے تھے۔ نسوانی امراض اور زچگی وغیرہ کے معاملہ میں تو وہ پوری لیڈی ڈاکٹر تھیں۔

گھر میں بہو بیٹیوں ہی کا نہیں بلکہ پریاگ میں ہمارے بنگلہ کے احاطہ میں رہنے والے ملازموں کے بیوی بچوں کا علاج والدہ صاحبہ ہی کا ہوتا تھا۔ طب یونانی اور دیسی دواؤں کے خواص سے بھی کافی واقفیت تھی۔ مریض کی تیمارداری اور علاج بڑی توجہ اور رغبت سے کرتی تھیں۔

طبقۂ نسواں میں اعزاز

یہ سب خوبیاں تو تھیں ہی، مگر جو بات ہر ایک کو ان کی طرف کھینچتی تھی وہ اُن کا برتاؤ تھا۔ بچّے، جوان، بوڑھے سب اُن سے خوش رہتے تھے۔ قدیم خیال کی عمر رسیدہ عورتوں میں والدہ صاحبہ کی بڑی عزّت تھی۔ برادری کی رسم و رواج، شادی بیاہ کے موقعوں پر لینا دینا، پوجا پاٹ کے اصول اور قاعدے غرضکہ ہر معاملہ میں مرحومہ سے رائے لی جاتی تھی اور اُس پر عمل کیا جاتا تھا۔ اسکول اور کالج میں پڑھنے والے گھر کے لڑکے لڑکیاں بڑے شوق سے امّاں جی کے گرد جمع رہتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ اُنھیں خوب یاد تھی۔

گانا سننے کا شوق

گانا بجانا جس کا آجکل اتنا رواج ہے اُنھوں نے نہ تو سیکھا تھا، نہ جانتی ہی تھیں، مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا میری لڑکی لیلا کا گلا بہت اچھا تھا۔ میرا کے بھجن بڑے شوق سے گاتی تھی۔ مرحومہ گھنٹوں اُس سے بھجن سنتیں اور ایک عالم میں کھو جاتیں۔

مرکزی شخصیت

ہمارے کنبہ میں سب سے زیادہ قدر و منزلت والدہ صاحبہ ہی کی تھی۔ خاندان میں جج، وکیل، ڈاکٹر، کاروباری لوگ اور ہر طرح کے سرکاری عہدیدار ہیں۔ ہمارے یہاں ان سب کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ جب کبھی میں ملازم سے پوچھتا کہ فلاں صاحب جو آئے تھے کہاں ہیں؟ تو جواب ملتا کہ "بھوجی کے پاس ہیں"۔ جو آتا سیدھا

سہاگ رانی جی کے پاس جاتا، اُن سے اپنا دُکھ درد بیان کرتا۔ وہ بڑی محبت سے سب کا حال سنتیں اور نیک صلاح دیتیں۔

ان کو ہر شخص کے مناسب حال گفتگو کرنیکا بڑا سلیقہ تھا۔ انجنیر سے فن تعمیر کے متعلق بات چیت کرتیں اور ڈاکٹر سے طبی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ میرا دستور تھا کہ اکثر رات کو کھانے سے فارغ ہو کر اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا اور اپنے مقدموں کا حال بیان کرتا۔ وہ واقعات و معاملات کو اچھّی طرح سمجھ کر اپنے تجربہ و ذہانت سے ایسے ایسے باریک نکات بتاتیں کہ مجھے اُن سے خاص مدد ملتی تھی۔

رنج و تکلیف میں مرحومہ کی طرح تسلّی دینے اور صبر کی تلقین کرنیوالا شاید ہی کوئی ہو گا۔ جہاں کہیں وہ ایسے موقعوں پر جاتیں تو اُنھیں دیکھکر غمزدوں کی ڈھارس بندھ جاتی۔ اور اُن کے تسکین بخش جملوں سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو بڑا سکون حاصل ہوتا۔

سروپ رانی نہرو سے تعلّقات

مرحومہ سروپ رانی نہرو کے ساتھ والدہ صاحبہ کے گہرے تعلقات تھے۔ وہ میری والدہ کو بجائے اپنی بڑی بہن کے مانتیں اور اسی رشتہ کے لحاظ سے مجھے اپنا بیٹا کہتی تھیں۔ اکثر فرماتیں کہ "سہاگ رانی کی بات چیت اور ان کے نیک خیالات اور نصائح مجھی بہت پسند آتے ہیں اور میرے غموں کو بہت کچھ

ہلکا کر دیتے ہیں"۔ غرض اس قسم کی بکثرت مثالیں ہیں۔ اُن کے اوصاف کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مرحومہ نے کبھی کسی پبلک جلسہ میں شرکت نہیں کی نہ کسی پلیٹ فارم پر سے اُنھیں تقریر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ان باتوں کا اُنھیں موقع بھی نہ ملا۔ لیکن جس حلقہ میں اُن کا ملنا جلنا تھا اور جن لوگوں میں اُن کی زندگی بسر ہوتی تھی، وہ پریاگ میں کافی بڑا حلقہ تھا اور اس پر اُن کا کافی اثر تھا۔

سیاسی خیالات

وہ سیاسی معاملات میں خاصی دلچسپی لیتی تھیں اور ملک کی سیاسی رفتار سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ہندو مسلم سوال ان کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ یہ بھی کہتی تھیں کہ ہندوؤں کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی گئی ہے، ہندوستان اُن کا وطن ہے تو حکومت میں بھی اُن کا کافی حصّہ ہونا چاہیئے۔

والد صاحب کے ساتھ اُنھوں نے سارے ہندوستان کا سفر کیا تھا ملک کی غریب رعایا کی فلاح و بہبود ہر وقت اُن کے پیش نظر رہتی تھی اور اس معاملہ میں وہ گاندھی جی کو برابر سراہا کرتی تھیں۔ وزراے کانگریس کی کانفرنس کی جو پالیسی ترکِ شراب کے متعلق تھی وہ اُس کی پرزور تائید کرتی تھیں۔

چائے کے خلاف

چائے پینے کے بہت ہی خلاف تھیں۔ پریاگ میں "ماگھ میلہ" تھا۔ تربینی اشنان کرنے گئیں۔ وہاں سے

لوٹ کر مجھ پر بہت ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں کہ "تم لوگ انتظام نہیں کرتے ہو، غریبوں کا کیسا کچھ نقصان ہو جائیگا" میں نے عرض کیا "اماں جی! آخر کیا بات ہے؟" فرمایا کہ "چائے کے باغیچوں کے مالکوں کی طرف سے گنگا جی کے کنارے کیمپ لگایا گیا ہے جہاں چائے کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے مفت چائے پلائی جا رہی ہے۔ وہ لوگ تو محض اپنے نفع کی خاطر فیاضی دکھا رہے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی چاء سے مانوس ہو جائیں اور اس کا پینا اختیار کر لیں" مرحومہ کا خیال تھا کہ ہمارے ملک کے باشندوں کو دودھ دہی کی ضرورت ہے۔ ہندوستان جیسے گرم ملک میں چائے صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ اس سے بھوک بند ہو جاتی ہے۔ کہتی تھیں کہ "تم سرکاری ملازم تھوڑی سی آمدنی کے پیچھے ملک کو تباہ کر رہے ہو"

طرز گفتگو

اُن کی گفتگو کا طرز شیریں اور سنجیدہ تھا۔ فضول باتیں بنانے سے انھیں نفرت تھی۔ ایسی گفتگو پسند کرتی تھیں جس سے علم و تجربہ میں کسی قسم کا اضافہ ہو سکے۔ آخر وقت تک وہ مفید باتیں بتانے اور سننے کی دلدادہ رہیں۔

ضبط و استقلال

وہ ضبط و استقلال کا زندہ مجسمہ تھیں۔ میں نے کبھی کسی پر انھیں غصہ ہوتے نہیں دیکھا۔ نہ خوشی میں حد سے زیادہ خوش ہوتیں، نہ رنج میں بیحد رنجیدہ۔ دکھ سکھ میں متوازن

رہتی تھیں۔ جاہل عورتوں کی طرح رونے دھونے کی عادت نہیں تھی۔ گھر میں بہت سی شادیاں ہوئیں۔ لڑکیوں کی رخصت کے وقت عام طور سے سارے ہی مائکے والے روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ لیکن والدہ صاحبہ خاموشی کی تصویر بنی رہتی تھیں۔ میں نے ایسے وقت میں اُنھیں کبھی ایک آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ اگر بیٹی یا پوتی ماتاجی کی جدائی کے صدمہ سے روتی تو اُسے یہ کہہکر منع کریں کہ "رومت۔ مجھے شک ہوتا ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کا دن ہے کہ تو اپنے گھر جا رہی ہے"

والدہ صاحبہ نے دُکھ بھی اُٹھائے۔ بڑے لاڈ پیار کی پالی پوسی شادی شدہ بیٹی اور پوتی اُن کے سامنے اُٹھ گئیں۔ ان صدموں کو اُنھوں نے بڑے صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ کسی حالت میں بھی ہمّت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

خواتین خاندان سے برتاؤ

وہ ہر ایک کے ساتھ خلوص اور شفقت کا برتاؤ کرتی تھیں۔ اُن کے مائکہ میں ایک بھائی گود آیا تھا۔ جب ان بھائی کی شادی ہوئی تو میں نے نند بھاوجوں میں ایسا اتفاق کہیں نہیں دیکھا جیسا کہ یہاں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں حقیقی بہنیں ہیں۔ اسی اخلاص محبت کی وجہ سے میری یہ مومانی مجھے مثل اپنے بیٹے کے سمجھتی تھیں اور میں انھیں ماں کی طرح مانتا تھا۔ میں نے لاہور میں پانچ برس ان ہی کے گھر رہ کر بی اے پاس کیا۔

میرے ماموں کی اولاد اور اُن کے داماد مرحوم دیوان بہادر برج موہن ناتھ زتشی کو والدہ مرحومہ کے ساتھ جیسی کچھ محبت و عقیدت تھی اُسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اُن کا دل ہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتا تھا۔

بہوؤں سے محبت

گھر میں والدہ صاحبہ اپنی بیٹیوں سے زیادہ بہوؤں سے پیار محبت کرتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ بیٹیاں تو دوسرے کے گھر گئیں۔ میرے گھر کی آبادی تو ان بہوؤں سے ہے۔ اس مشفقانہ برتاؤ کا نتیجہ یہ تھا کہ گھر میں کبھی کوئی ناگوار بات پیش نہیں آنے پاتی تھی۔ ہمیشہ امن و امان رہتا تھا اور سب ہنسی خوشی سے مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے۔ بہوؤں کی نظر میں بھی والدہ صاحبہ ساس نہیں بلکہ ماں کی طرح تھیں۔ ہمارے خاندان میں ماشاءاللہ بہت سی بہو بیٹیاں ہیں۔ سب مرحومہ سے اتنی محبت اور ان کا اتنا احترام کرتی تھیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

وسعت معلومات

جو بھی اُن کے پاس تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاتا کوئی نہ کوئی مفید بات سنکر ہی اُٹھتا تھا۔ نئے زمانے کی بی اے، ایم اے پاس لڑکیوں سے لیکر پُرانے خیال کی ان پڑھ بڑی بوڑھیوں تک سب والدہ صاحبہ کو اعلیٰ تعلیمیافتہ اور تجربہ کار تسلیم کرتیں اور اُن کے علم و تجربہ سے فائدہ حاصل کرتی تھیں۔ کالج کی اعلیٰ ڈگری یافتہ عورتیں مرحومہ کی باتوں کو سنکر بیحد مسرور ہوتیں۔ اُنھیں یہ بات حیرت میں ڈالدیتی تھی کہ یہ بزرگ

خاتون جو اتنی عمر رسیدہ ہیں اور انگریزی سے ناواقف انھوں نے تاریخ، جغرافیہ نجوم، سائنس اور ڈاکٹری میں یہ معلومات کہاں سے حاصل کر لی۔ اسی کے ساتھ مرحومہ کے خیالات اتنے بلند تھے کہ وہ اِن خواتین کی اور بھی حیرت کا باعث ہوتے تھے۔

ہمارے یہاں پریاگ میں ایک پارسی لیڈی مِس کمسریٹ نامی نہایت قابل تھیں۔ اُنھوں نے انگلستان اور امریکہ میں اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں حاصل کی تھیں یہ خاتون والدہ صاحبہ سے اس درجہ مانوس ہو گئی تھیں کہ اُنھیں اپنی ماں بنایا تھا اور اپنے آپ کو ان کی بیٹی کہنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔

جوتش میں مہارت

والدہ صاحبہ کو مسلسل مشق کی بدولت جوتش میں اچھی خاصی مہارت ہو گئی تھی۔ پریاگ میں اُن کے قیام کے زمانہ میں جب کبھی ہمارے احاطہ کے نوکروں کے یہاں بال بچہ ہوتا تو اُس کی جنم کنڈلی مرحومہ ہی بناتی تھیں۔ یہاں جب میرے پاس کوئی جوتشی صاحب تشریف لاتے تو میں براہ راست اُنھیں والدہ صاحبہ سے ملا دیتا اور کہدیتا کہ بدن صاحب! مجھے تو کچھ آتا نہیں۔ مہربانی فرما کر آپ میری والدہ صاحبہ سے گفتگو فرما لیجئے۔" نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے تو اُن سے چھٹکارا مل جاتا اور جوتشی صاحب کی خوب قلعی کھل جاتی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے مرحومہ کی بتائی ہوئی تمام باتیں صحیح ثابت ہوئیں۔

چالیس سال ہوئے جب میں کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ اُس وقت اُنھوں نے میری پوری زندگی کا نقشہ کھینچ دیا تھا۔ ان چالیس برسوں کی بابت اُن کی بتائی ہوئی ساری باتیں سچ نکلیں۔ آئندہ جو زندگی باقی ہے اُس میں کیا ہو گا اس کا علم تو خدا ہی کو ہے، مگر وہ تو یہ بھی بتا گئی ہیں کہ میری زندگی کا پیمانہ لبریز ہو کر کب چھلک جائیگا۔

اچھوتوں سے سلوک

کھانے پینے کے معاملہ میں تو وہ اصول اور قاعدوں کی بڑی پابند اور محتاط تھیں۔ کچا کھانا میرے ہاتھ کا بھی چھوا ہوا نہیں کھاتی تھیں۔ مگر جہانتک اچھوتوں کے مسئلہ کا تعلق ہے وہ اسے بالکل نہیں مانتی تھیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ چمار اور بھنگی عورتوں اور اُن کے بچوں کو بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھاتیں، ان کی دوا دارو کرتیں اور بچوں کو گود میں لیتیں۔

غذا

اُن کے رہنے سہنے کا طریقہ بہت ہی سادہ ہو گیا تھا۔ گوشت مچھلی کھانے کا کشمیری پنڈتوں میں رواج ہے اور ہمارا گھرانا تو شاردا دیوی کا پرستار ہی۔ مگر والدہ صاحبہ نے کئی برس سے ان چیزوں کا کھانا ترک کر دیا تھا۔ وہ اپنا کھانا خود اپنے ہاتھ سے یا برقی چولھے کے ذریعہ تیار کر لیتی تھیں۔ رات دن میں صرف ایک مرتبہ دوپہر کے وقت کھاتیں، رات کو ایک پیالی دودھ پیتی تھیں۔

صحت

صحت بہت اچھی تھی۔ آخری وقت آنکھ میں خراب قسم کا موتیا بند ہوگیا تھا جس کی وجہ سے آنکھوں کی روشنی انتقال سے تین سال قبل جاتی رہی تھی۔ پھر بھی اُن کے تمام معمولاتِ زندگی بدستور جاری رہے۔

اولاد

ہم پانچ بھائی بہن تھے۔ والدہ صاحبہ کو سبھی سے محبت تھی مگر ہم میں سے ہر ایک یہی کہتا تھا کہ مجھ کو سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔ کہا کرتی تھیں کہ "چوبیس برس کی عمر تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مجھے اس کا کوئی زیادہ غم نہ تھا۔ نہ اولاد کی ایسی تمنّا تھی۔ اسے جنجال ہی سمجھتی تھی۔ اس عمر میں پہلے پہل لڑکی ہوئی، اس وقت مجھے یہ تمنّا ضرور ہوئی کہ قدرت نے جب اولاد دی ہے تو لڑکا بھی عطا فرمائے۔ میں نے شیوجی سے اس کی التجا کی اور جب چار برس بعد تو پیدا ہوا تو میری ساس کہنے لگیں کہ کاٹجو خاندان میں دو پشتوں سے کوئی لڑکا نہیں ہوا تھا۔ گو دمانگ کر یہ گھر چلا ہے۔ میرے نصیب میں کہاں کہ میں اس لڑکے کا سکھ دیکھوں۔ ان کا کہنا ٹھیک نکلا۔ آٹھ ہی مہینے بعد دنیا سے رخصت ہوگئیں۔"

"میں بھی بیمار پڑ گئی۔ زچگی کے بعد ہی سے دو سال تک بخار آتا رہا۔ جیسے دق ہوگئی ہو۔ نئے سرے سے زندگی ہوئی۔ راتوں کو اکثر بیقرار ہو جاتی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے۔ بار بار سوچتی تھی کہ یہ بچّہ اتنی منّتوں مرادوں کے بعد تو ملا ہے معلوم نہیں میرے بعد کون اس کی دوسری ماں بنے اور یہ کس کے ہاتھوں میں جائے

شیو بھگوان سے دعائیں مانگتی تھی کہ آپ نے مجھے لڑکا دیا ہے تو اس کی پالنے کے لئے عمر بھی عطا فرمائیے۔ بھگوان نے میری التجا سن لی اور ایسی سنی کہ ایک تجھی کو نہیں پالا پوسا بلکہ تیری اولاد اور اُن کی اولاد کا سُکھ بھوگ رہی ہوں۔ تو بھی مجھ سے چمٹا ہی رہتا تھا۔ چار برس تک تو نے میرا دودھ پیا ہے"۔

الہیٰ! ماں کا بار احسان بھلا کون اتار سکتا ہے اور اُتارے بھی تو کس طرح؟

آخری عمر کے واقعات

آخری عمر میں بینائی کے جاتے رہنے سے چلنا پھرنا ترک ہو گیا تھا تاہم نوکر کا ہاتھ پکڑ کر باغ میں ٹہلا کرتی تھیں تاکہ صحت ٹھیک رہے۔ جب اسّی ۸۰ برس کی عمر ہو گئی تو گوتم بدھ کی طرح کہنے لگیں کہ "یہ جسم اب کام کا نہیں رہا۔ مرجانا ہی بہتر ہے۔

صحت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بدن لٹک گیا تھا۔ اب اُنھوں نے اپنے آخری سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جو کچھ اُن کا زیور تھا وہ بہو بیٹیوں اور اُن کی اولاد میں تقسیم کر دیا۔ اور جو کچھ خیر خیرات کرنا تھی سب اپنے سامنے اپنے ہاتھوں سے کر دی۔ ایک صندوق میں اپنے واسطے ایک جوڑا ساڑھی وغیرہ رکھوا دی کہ مرنے کے بعد پہنائی جائے۔ غرضکہ اپنے آخری سفر کے لئے پوری طرح تیار ہو گئیں۔ اس زمانہ میں گیتا کثرت سے خود زبانی پڑھتیں اور دوسروں سے پڑھوا کر سنا کرتیں۔ خاص کر آٹھویں باب سے بڑا شغف تھا۔

وفات

آخر قدرت نے اُن کی آخری دلی مراد پوری کی سمت ۱۹۹۶ ساون کے مہینہ میں جبکہ بھری چاندنی راتوں کی تاریخیں تھیں شنکر جی کے برت کے دن ڈیڑھ بجے دوپہر کو جس وقت آفتاب پوری تیزی پر تھا پریاگ راج کی مقدس سرزمین میں جیسی کہ اُن کی دلی تمنّا تھی اس دارِ فانی سے چل بسیں۔ مرتے دم کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ باتیں کرتے کرتے کروٹ لی اور دوسرے جہان کو سِدھار گئیں۔

ہم سب اُن کے پاس موجود تھے۔ صرف میری اہلیہ اپنی علالت کے باعث نینی تال میں مقیم تھیں۔ اُنھیں کو بار بار یاد کرتی تھیں۔ کئی مرتبہ پوچھا کہ لکشمی رانی نہیں آئیں؟ کب آئیں گی؟ اس کے بعد بہت سکون اور آسانی کے ساتھ جیسا کہ بھگوان نے موت کی بابت بتایا ہے کہ

"انسان اپنے پرانے لباس کو چھوڑ کر نیا لباس بدلتا ہے"

اسی کے مطابق میری والدہ نے اپنے جسم کو چھوڑ دیا۔ لکشمی رانی بھی چند ہی گھنٹوں کے بعد آگئیں اور مرحومہ کے آخری درشن کر لئے۔

اُس دن مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ کیوں ہندو عورتوں کو اس بات کی آرزو رہتی ہے کہ اپنا سہاگ اپنے ساتھ لے جائیں۔ مرحومہ بہت برسوں سے رنگین کنارے کی سفید ساڑی پہنا کرتی تھیں۔ اگر کوئی رنگین یا ریشمین کپڑا لاکر اُن سے پہننے کی درخواست کرتا تو فرماتیں کہ بڑھاپے میں بھلا مجھے یہ کیا زیب دیگا

لیکن جو ساڑی اُنھوں نے اپنے آخری سفر کے لئے انتخاب کر کے بحفاظت صندوق میں رکھدی تھی وہ نہایت خوبصورت سُرخ رنگ کی تھی۔ اور جب نہلاکر ان کو وہ کپڑے پہنائے گئے ہیں تو درحقیقت ایسی حسین معلوم ہوتی تھیں جیسے کہ کوئی نئی دُلہن ہو۔ خدا کی قدرت کہ اُن کے چہرہ پر سے بڑھاپے کے سارے نشانات غائب ہو گئے تھے اور سہاگ رانی اپنا سہاگ ساتھ لے کر ہنسی خوشی چلی گئیں۔

میری حسرت

مجھے اُن کے جانیکا تو صدمہ نہیں ہوا۔ بیشک اس بات کا بیحد صدمہ ہوا کہ ان کی خدمت کا جیساکہ حق تھا میں ادا نہ کر سکا۔ مال و دولت کے ذریعہ خدمت کوئی خدمت نہیں تھی۔ کیونکہ گھر میں جو کچھ روپیہ پیسہ تھا سب ان کا ہی تھا۔ مجھے ان کی خدمت خود اپنے ہاتھ پاؤں سے کرنا کرنا چاہئے تھی۔ میں اپنے مشاغل میں ایسا گرفتار رہتا تھا کہ مجھے اپنا جسم و جان لگاکر یہ شرف حاصل نہ ہوسکا کہ اُن کے پاؤں دھو دھو کر اپنی آنکھوں سے لگاتا۔ اُنھوں نے اپنے آخری وقت تک بیماری دُکھی ہر حال میں میری خبر گیری کی۔ میں اُن کے لئے کچھ نہ کرنے پایا۔

اب تمنّا ہے تو یہ اور دعا ہے تو یہ کہ آئندہ جنم میں بھی میرا اُن کا ساتھ ہو۔ وہ میری گرو ہوں اور میں اُن کا چیلا ہوں، یا پھر وہی میرے ماں باپ ہوں اور میں اُنکا فرزند ہوں تاکہ جو ارمان میرے دل میں اُنکی خدمت کے باقی رہ گئے ہیں وہ سب پورے ہوسکیں۔